پارسی

ترجمہ ——— مقدمہ

جناب آصف علی مرحوم

پیش لفظ

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

ابتدائیہ

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

شائع کردہ

مجلسِ یادگارِ آصف علی و شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی،

سلسلۂ مطبوعاتِ شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی

پارسی

اشاعتِ اوّل

جنوری سنہ ۱۹۷۴ء

قیمت : ۳۰ روپے

مطبوعہ : جمال پرنٹنگ پریس دہلی

فہرست

آصف علی مرحوم کی تصانیف

(۱) پرچھائیں اور اُس کا دوسرا رُخ
(۲) باغی : تمثیل
(۳) اسٹالن (ترجمہ)
(۴) پارسی : ایکلس کی تمثیل کا ترجمہ
(۵) ارمغانِ آصف : نثر و نظم کا مجموعہ
(۶) خود نوشت سوانح عمری
(۷) صمصامِ خزاں

(۸) CONSIRUCTIVE NON-COOPERATION

(۹) THE ASAF ALI TRIAL

(۱۰) REPORT ON NORTH-WEST FRONTIER PROVINCE AND BANNU RAIDS, 1938.

(۱۱) CULLED FROM MY OWN GARDEN

(۱۲) THE COMMON MAN'S STATE SPEECHES 1948, 1951

(۱۳) GOSSAMER AND TWILIGHT

ابتدائیہ

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

میں کبھی کبھی ہندوستان کی تحریکِ آزادی پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس نے کیسے کیسے جامع حیثیات اشخاص پیدا کیے تھے جو مدبّر اور سیاست داں بھی تھے، ادیب اور شاعر بھی، مجاہد اور معنیٔ لفظِ آدمیت بھی۔ یہ فہرست بہت طویل ہے لیکن میں صرف پنڈت نہرو، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور آصف علی صاحب کا نام لیتا ہوں جن سے مجھے ذاتی طور پر نیاز حاصل تھا۔ یہ حضرات آسمانِ سیاست ہی کے درخشاں ستارے نہیں تھے، علم و ادب میں بھی غیر معمولی امتیاز رکھتے تھے۔

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

قلعۂ احمد نگر میں یہ تینوں رہنمایانِ قوم ایک ساتھ محبوس اور مقیّد تھے، جہاں انھوں نے آزادی کے خواب دیکھے، خوش آیند مستقبل کے منصوبے بنائے اور اپنے خونِ جگر سے علم و ادب کی خدمت کی۔ پنڈت نہرو نے تلاشِ ہند لکھی جو ایک نئی قسم کی تاریخ ہے۔ نہایت دلکش اور بلیغ۔ مولانا آزاد نے قرآنِ پاک کا

ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی جو کئی اعتبار سے تفاسیر میں سرِ فہرست ہے۔ آصف علی صاحب نے ایسکلس کے ناٹک پارسی کا ترجمہ کیا جس میں ایران کے زوال اور یونان کے عروج کی کہانی ہے۔ یہ جامہ ایران ہی پر نہیں، ہندوستان پر بھی چست بیٹھتا ہے اور اسی لیے شاید آصف علی صاحب نے اس کو انتخاب کیا ہے۔

اس تاریخی ناٹک کا مصنّف ایسکلس (۴۷۲ ق م) ہے جو اس نے ۴۸۰ ق م میں ایران پر یونانیوں کی فتح کی یادگار میں لکھا تھا۔ یہ تابلو کی قسم کی چیز ہے۔ اس کو ڈرامہ کہنا زیادہ صحیح نہیں ہوگا تاہم یہ دُنیا کا پہلا تاریخی ناٹک ہے۔ اس میں نہ کوئی ہیرو ہے، نہ تصادم ہے، نہ آویزش ہے۔ صرف چند عبرت انگیز اور رنج فزا حقایق کی نشان دہی ہے۔ اس میں ایران کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ چند ایرانی عمائدین اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں اور یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ایران کے نوجوانانِ پیل تن کس جاں فروشی کے ساتھ یونان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ محاذِ جنگ سے ان کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ پھر علیا حضرت داخل ہوتی ہیں۔ انھوں نے ایک منحوس خواب دیکھا ہے اور وہ اپنے بیٹے کی طرف سے سخت فکر مند ہیں۔ وہ پوچھتی ہیں یہ ایتھنس کیا بَلا ہے۔ مطلع کیا جاتا ہے کہ یہ مغرب میں ایک شہر ہے جس کے باشندے کبھی غلام نہیں ہوئے۔ عین اس وقت ایک قاصد حاضرِ خدمت ہوتا ہے اور یہ بد خبری سُناتا ہے کہ ایرانیوں کو سلامس (SALAMIS) کے مقام پر شکستِ فاش ہوئی ہے۔ وہ لڑائی کی تفصیل سُناتا ہے اور کہتا ہے کہ یونانیوں نے ایرانیوں کو دھوکا دیا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ ہار گئے ہیں اور پسپا ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ ایرانیوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کو بڑے پیمانے پر تہ تیغ کیا۔

علیا حضرت دردِ غم سے بے چین ہو کر دارائے اعظم کی قبر پر شراب چڑھاتی اور الحاح و زاری کرتی ہیں۔ اس آہ و بکا سے پریشان ہو کر دارا کی روح ظاہر ہوتی

ہے اور یہ اطلاع دیتی ہے کہ ایران کی بڑی فوج PLATAEE پر تباہ ہو جائے گی۔ آخر میں XERXES داخل ہوتا ہے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں اور وہ ایرانی جہازوں اور ایرانی بہادروں کی تباہی سے سخت آزردہ اور رنجیدہ ہے۔ یہ جلوس گریاں اور نوحہ کناں محل میں داخل ہوتا ہے اور ناٹک ختم ہو جاتا ہے۔

اس ڈرامے میں حب الوطنی کے جذبے کا اظہار کیا گیا ہے جس کو اس زمانے کا نوخیز یونانی مدبّر PERICLES خاص طور پر اُبھارنا چاہتا تھا۔ بحری لڑائی کا منظر بھی خوب کھینچا ہے جس کو شاید ایسکلس نے بچشم خود دیکھا تھا۔

یہ اُردو کی خوش قسمتی ہے کہ اس مشہور یونانی ڈرامے کا ترجمہ آصف علی صاحب نے کیا جو مشرق و مغرب کے ادبیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور جو قید و بند کے دشتِ جگرتاب میں بھی کبھی علمی کاموں سے دست کش نہیں ہوئے۔ اس ترجمے میں انھوں نے قید خانے کی فرصت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ بڑی جگرکاوی کی ہے اور اس نقش کی درستگی میں دل و نگاہ و نفس سب کچھ لگا دیا ہے۔

پارسی کی اشاعت تیس برس کے بعد اس وقت ہو رہی ہے جب نہ آصف علی صاحب حیات ہیں، نہ مولانا آزاد۔ یہ ترجمہ اب بھی اشاعت پذیر نہ ہوتا اگر بیگم ارونا آصف علی کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی۔ اُن کا شکریہ کس طرح ادا کروں؛ ان کا تپِ غم، ان کا سوز و ساز، ان کا جہادِ زندگی، خود افروز و جگرسوز، ان کے ادراک کی تیزی، ان کے ذہن کی جودت، ان کا تہذیبی قدروں پر ایمان و ایقان صرف میرے ہی لیے نہیں، پورے ہندوستان کے لیے باعثِ نازش ہے ؎

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح　　　　در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خارا ایم

حق تعالیٰ ان کو صد و سی سال سلامت رکھے۔

خواجہ احمد فاروقی

پیش لفظ

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

قلعہ احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں میرے رفیقِ زنداں آصف علی صاحب نے چند چیزیں قلمبند کی تھیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب ان کی اشاعت کا سروسامان کیا جا رہا ہے۔

ان میں ایک خاص چیز۔ ایسکلس کا یونانی ڈراما "پارسی" ہے۔ اس کو انھوں نے اُردو نثر اور نظم، دونوں کا جامہ پہنایا ہے۔ زمانۂ حال کے نقّادوں کی رائے میں یہ ایسکلس کا بہترین ڈراما نہیں ہے۔ تاہم اسے ترجمے کے لیے منتخب کیا گیا، کیونکہ اس کا تعلق ایران قدیم کی تاریخ سے ہے اور اس لیے یہ توقع کی گئی ہے کہ اُردو علم ادب کے شائق اس کے مطالعے میں زیادہ اجنبیت محسوس نہیں کریں گے۔ انگریزی میں اس کے دو ترجمے متداول ہیں۔ ایک بلیکی کا، دوسرا پوٹر کا۔ اس ترجمے میں اوّل الذکر پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ عربوں نے اپنی علمی جستجو کے زمانے میں یونان کے تمام علوم میں دل چسپی لی لیکن یونانی زبان کی ادبی خصوصیات انھیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ عربی زبان اور اس کے زیر اثر فارسی زبان یونان کے فلسفیوں اور طبیبوں کے ناموں میں تو کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتی لیکن اس کے شاعروں، خطیبوں اور تمثیل نگاروں کی اسے کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ ابن رشد نے ارسطو کے مقالات اور افلاطون کی جمہوریت کی شرحیں

لکھیں۔ ان میں جا بجا یونانی شاعروں اور تمثیل نگاروں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ مثلاً ارسطو نے کئی مقامات میں سوفاکلیس کا ذکر کیا ہے۔ ابن رشد ان مقامات کی شرح کرتا ہے لیکن چونکہ حقیقتِ حال سے بے خبر ہے اس لیے ان کا صحیح مفہوم متعین نہیں کر سکتا۔ اُس نے ٹریجڈی کو مرثیہ اور کامیڈی کو ہجو اور ہزل قرار دیا ہے!

ایسا ہی تغافل عربوں نے سنسکرت کی ادبیات کے ساتھ بھی برتا ہے۔ البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوؤں کے تمام علوم و فنون کا ذکر کیا ہے۔ سنسکرت کے صرف و نحو اور عروض و قوافی کی باریکیوں سے بھی بے خبر نہیں ہے۔ تاہم ناٹک کا وہ کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ یونانی زبان کی طرح سنسکرت کی بھی سب سے بڑی ادبی خصوصیت اس کے عدیم النظیر ڈراموں ہی میں نمایاں ہوئی ہے۔

یورپ کے مستشرقوں نے عربوں کے اس تغافل کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یونانیوں کے اصنامی عقائد کی آمیزش نے ان کے علم ادب کو عربوں کے لیے ناقابلِ قبول بنا دیا تھا۔ رنیاں نے یہی توجیہہ کی ہے اور اس پر قانع ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک خاص حد تک یہ توجیہہ قابلِ لحاظ ہو لیکن ہم اس پر مطمئن نہیں ہو جا سکتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بابلیوں اور ہندوؤں کا علم نجوم بھی ان کے اصنامی خیالات کی آمیزش سے خالی نہ تھا، تاہم یہ بات عربوں کو اس سے نہ روک سکی کہ وہ اسے اپنی زبان میں پوری طرح منتقل کر لیں۔ در اصل اس تغافل کی علت ہمیں کسی دوسرے ہی گوشے میں ڈھونڈھنی چاہیے۔ عربی زبان نے اوّل روز سے شاعری اور خطابت کی گودوں میں پرورش پائی تھی۔ عربوں کو اپنی گویائی اور فصاحت کا اس درجہ

فخر تھا کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اپنے مقابلے میں گونگا سمجھتے تھے اور اس لیے عجمی کہتے تھے۔ انھوں نے دوسری قوموں سے علوم لے لیے، کیونکہ اس متاع سے ان کی جیب خالی تھی لیکن وہ دوسری قوموں کی شاعری اور بلاغت کی طرف متوجہ نہ ہو سکے، کیونکہ انھیں یقین تھا کہ اس متاع سے خود ان کا کیسہ مالا مال ہے۔

بہر حال اس تغافل کی علت کے بارے میں کتنی ہی مختلف رائیں ہوں لیکن اس کے نتائج کے بارے میں اختلاف رائے کی گنجایش نہیں۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عربی زبان یونانی زبان سے اس قدر قریب آجانے پر بھی یونانی ادبیات کی روح سے نا آشنا رہی۔ اور یونانی فنونِ لطیفہ کی خصوصیات کی کوئی جھلک اس میں نمایاں نہ ہو سکی۔

ایران کے بعد از اسلام دور میں فارسی علم ادب کی بنیاد عربی علم ادب کے زیر اثر پڑی تھی۔ اس لیے عربی کی طرح فارسی بھی یونان کی شاعری اور تمثیل نگاری کے ذخیرے سے یکقلم نا آشنا رہی۔ یہی صورتِ حال سنسکرت کے ساتھ بھی پیش آئی۔ سنسکرت کا علم ہیئت، طب، ریاضی اور فلسفے کا ایک حصہ عربی میں منتقل ہو گیا، لیکن سنسکرت کی شاعری اور ناٹکوں کی نہ تو اسے کوئی خبر ملی اور نہ عربوں نے اسے قابلِ التفات سمجھا۔

اُردو زبان میں سنسکرت کے بعض ناٹکوں کے ترجمے کی کوششیں کی جا چکی ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، یونانی ڈراموں کے ترجمے کی اس وقت تک کوئی کوشش عمل میں نہیں آئی۔ پارسی کے اس ترجمے نے اب یہ نئی راہ اہلِ قلم کے سامنے کھول دی ہے۔

ترجمہ بجائے خود ایک مشکل کام ہے اور پھر اگر نظم کا نظم میں کیا جائے تو اس کی مشکلات اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے اس ترجمے کو اس نظر سے

نہ دیکھا جائے کہ شاعرانہ محاسن جو ایک مستقل نظم میں نمایاں ہوتے ہیں، کہاں تک اس میں نمایاں ہو سکے ہیں؟ اس طرح کی نظموں کے جانچنے کے لیے صرف ایک ہی معیارِ نظر صحیح ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ بات دیکھی جائے کہ اصل کی خصوصیات کہاں تک قائم رکھی جا سکیں ہیں اور بہ حیثیت مجموعی اسلوب بیان کس درجہ سلیس اور رواں ہے؟

مجھے یقین ہے کہ اگر اس لحاظ سے ترجمے پر نظر ڈالی جائے گی تو اس کی خوبیوں کا اہلِ نظر اعتراف کریں گے۔

ابوالکلام

دہلی - ۲۸ جون ۴۶ء

مقدمہ

جناب آصف علی مرحوم

مبصروں کی نگاہ (ایسکلس) کے اس ڈرامے یا تمثیل کو اس یونانی استاد کا بہترین نمونہ یا جسے آج کل شہ کار کہتے ہیں، نہیں سمجھتی بلکہ فن کے اعتبار سے اس میں خامیاں پاتی ہے۔ اور صرف فن کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ نقش و نگار، جذبات اور تاریخی حالات اور صداقت واقعات کے اعتبار سے بھی اس تمثیل کو اُستاد کے قلم کا فروتر ہدیہ تصور کرتی ہے۔ اس صورت میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پھر اسے روشناسی کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟

جس غرض سے اس تمثیل کو چُنا گیا، اس میں ایک نہیں بلکہ کئی مصلحتیں پیش نظر تھیں۔ سب سے پہلے تو یہ مسئلہ غور طلب تھا کہ یونانی ادبیات سے اُردو داں شائقین ادب کو روشناس کرانے کے لیے کوئی ایسا مضمون ہو تو زیادہ موزوں ہوگا جو بالکل غیر مانوس اور قطعی طور پر اجنبی نہ ہو۔ اگرچہ اُردو داں تعلیم یافتہ اور متوسط طبقہ بعض یونانی اسماء و روایات قدیم سے چنداں ناآشنا نہیں مگر جن خاص ناموں اور روایتوں سے ان کے کان اور دماغ آشنا ہیں وہ یونانی ادبیات کے بحر زخّار میں چند قطرات سے زیادہ ہیں۔ سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، فیثاغورث اور چند اور مشہور نام دوہرا دینے کے بعد عام واقفیت کا میدان خالی ہو جاتا ہے، اور خاص واقفیت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چند مشہور روایات ہیں جو کچھ تاریخ کی

پرچھائیاں اور کچھ غلط العام رائج الوقت قصے کہانیاں ہیں، باقی قصہ کوتاہ!
یہ نام اور روایات بھی خلافت عباسیہ کے علمی دور کی یادگار ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اس دور کی طلب و تحصیلِ علم نے اپنا دامن زیادہ تر یونانی فلسفہ اور علوم و فنون کے اُن پھولوں کے لیے پھیلایا جن کا تعلق محض تفریح طبع اور ادبی لہو و لعب یا خالص اصنامی مذہب سے نہ ہو۔ حالانکہ یونانی، صنم پرستی، بت تراشی، شاعری، تمثیل نگاری، نقاشی، موسیقی اور ہر قسم کے رُوحانی اور دماغی مشاغل میں ڈوبے ہوئے تھے، اور یونانی ادب ایک عالیشان سربفلک کشیدہ حسن و جمال کا صنم کدہ تھا۔ تفصیل بہت وسیع ہے اور اس کا یہ محل نہیں، مگر اتنا اشارہ ضروری ہے کہ اس کا جو عکس اُردو داں طبقے تک پہنچا ہے وہ ایک ضلع کی پرچھائیں سے زیادہ نہیں۔ حیرت یہ ہے کہ اگرچہ قدیم ہندوستان کو یونانیوں سے کافی واسطہ رہا اور شمال مغربی ہندوستان میں مقدونوی اور باختری یونانیوں کی سالہاسال حکومت بھی رہی بلکہ پاٹلی پترا (موجودہ پٹنہ) میں یونانی رانیاں اور یونانی سفیر اور ان کے حلقے بھی رہے۔ مگر جہاں تک معلوم ہوا ہے سنسکرت کے ادبیات میں یونانی ادب تو ایک طرف فلسفے تک کا ذکر نہیں، اور یونانی ناموں اور روایتوں کا اتنا بھی چرچا نہیں جتنا اُردو میں آگیا۔ لے دے کے صرف ایک لفظ یَوَن (یونانی) جو پردیسی کے معنوں میں آتا ہے یا کالیداس کی شکنتلا میں (جو یونانی دور کے چھ سات سو برس بعد لکھی گئی) راجہ دشینت کے دربار میں یونانی رقاصاؤں کے آنے کا ذکر آجاتا ہے یا اسی طرح ادھر اُدھر کے کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ ہندو قدما نے یونانی ادبیات، فلسفہ، اور علوم و فنون سے کتنا استفادہ کیا اور برعکس اس کے یونانیوں نے قدیم سنسکرت یا پالی کی تصانیف سے

کتنا فیض حاصل کیا تحقیق طلب مضمون ہے۔ جس پر رفتہ رفتہ مغربی نقّاد روشنی ڈال رہے ہیں۔

ان حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ ظاہر تھا کہ یکایک یونانی ادبیات کے صنم کدے کا دروازہ کھولنے کا یہ اثر ہوگا کہ بالکل اجنبی خیالات کا ایک شیش محل سامنے آجائے گا جس میں گھسنا ایک بھول بھلیاں میں داخل ہونے کے برابر ہوگا۔ یونانی ادب اصنامی استعاروں اور حوالوں سے لبریز ہے۔ ہر نام ہر مقام ہر تشبیہ ہر روایت کے اشارے کے پیچھے طول طویل حکایات ہیں اور جب تک ان حکایات سے ذہن آراستہ نہ ہو دماغ کو لطف و تفریح کی جگہ انقباض اور تکدر سے دوچار ہونے کا قوی احتمال ہے۔ مثلاً جو شخص لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، وامق و عذرا، نل و دمن (نل اور دمینتی) سیتا وان اور ساوتری، ہیر رانجھا، سسی پنّو وغیرہ کے قصّوں سے پورے طریقے سے آشنا نہ ہو۔ اُسے اِن باریک، نازک اور لطیف حوالوں، اشاروں، تشبیہوں اور استعاروں سے فارسی، اُردو، پنجابی اور سندھی میں کیا حظ حاصل ہوسکتا ہے۔ یا جو شخص ہندی، ایرانی اور عربی روایات اور قدیم بتکدوں اور آتشکدوں کے لوازم اور حکایات سے آشنا نہ ہو۔ اسے شاعرانہ اشاروں کنایوں میں کیا مزہ آسکتا ہے۔

ہر ادبی مرقع میں ایک پس منظر اور ایک پیش منظر اور ہر تصویر کی ایک زمین ہوتی ہے جو نگاہ اس پس منظر کے خط و خال نوک پلک سے ناواقف ہو وہ لطف اندوز نہیں ہوسکتی۔ یونانی تمثیل کا دامن بہت وسیع ہے مگر اس میں نئے رنگ و بو کے پھول کثرت سے ہیں جن سے ابتدائی تعارف ضروری ہے۔ یونانی تمثیل نگاروں میں ایسکلس کا وہی درجہ ہے جو اُردو کے شاعروں

میں میر تقی کا یعنی اُستادوں نے اسے اُستاد مانا ہے۔ اس کے وہ نمونے جو اُستادانہ قلمکاری کا نتیجہ ہیں ایک سے زیادہ ہیں اور جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ہیں جو زمانے کی دستبرد سے بچ گئے تھے۔ اگا میمنون مبصروں کے نزدیک اس کا شہ کار ہے۔ جو زبان، شاعری، جذبات و تاثرات، قصّے کی ترتیب اور روابط کی کرشمہ سنجیوں اور تمثیل نگاری کی خصوصیات کے لحاظ سے تمثیل نگاری کی روح تصوّر کیے جاتے ہیں، ایک اعلیٰ پیمانے کا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ہیں جن میں سے بعض کا مناسب موقع و محل پر ذکر آئے گا۔ اس کی کل تصانیف بعض کے نزدیک اسّی سے زیادہ تھیں۔ ان سب میں سے "پارسی" کو منتخب کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ شہ کار نہ سہی مگر یہ ایک ایسی داستان ہے جس کی نوعیت مشرقی ادبیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے غیر مانوس نہیں ہو سکتی۔ جو کم سے کم ایک اعتبار سے اُردو داں طبقے کی اس واقفیت اور طلب واقفیت کی سرحد سے نزدیک ہے جس کے مبادیات تعارف کے محتاج نہیں۔

اگرچہ ابتدا میں ہندوستان کو یونان سے پہلے ایران سے واسطہ پڑا مگر قدیم ہندوؤں نے جس طرح یونانیوں کو بھلا دیا تھا اسی طرح ایرانیوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ برعکس اس کے عربوں کو اوّل روز سے آج تک عجمیوں میں ایران سے خاص تعلق رہا۔ اور ساتویں صدی مسیحی کے آخر دور سے تو چولی دامن کیا بلکہ دست و بازو کا رشتہ ہو گیا۔ اور آٹھویں صدی سے ان قوموں میں سے جنھوں نے اسلام قبول کیا عربوں اور ایک اعتبار سے اسی وقت سے ایرانیوں کا ہندوستان سے بھی چولی دامن ہی کا نہیں، صرف ہمسائگی کا نہیں بلکہ وطنیت ثانی اور جو یہاں بس گئے ان کے لیے وطن اوّل

کا رشتہ استوار ہوگیا چنانچہ اُردو کا جہاں ایک طرف سنسکرت کی بیٹیوں نواسیوں سے بہنایا اور سہلایا ہوا، وہیں دوسری طرف عربی اور فارسی سے خالہ پھپھی کا ناطہ ہوا۔ اُردو ادب کے طفل شیر خوار نے نہ صرف سنسکرت کا دودھ پیا بلکہ فارسی عربی اور ترکی کا بھی دُودھ اسے شیرِ مادر ہوکر رچا بچا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو ادب ایران کے زمانۂ وسطیٰ ہی کی نہیں بلکہ ایک گونہ زمانہ قدیم کی روایات و حکایات سے بہرہ اندوز ہوا۔ گویا یوں کہیے کہ اُردو کی دلہن میکے سے ایرانی زیورات اور عربی جہیز لے کر آئی اور سسرال میں اُسے سنسکرت کا چڑھاوا چڑھا۔ دونوں طرف سے مالا مال مرفہ حال ہوکر گھر سنبھال کے بیٹھ گئی۔

وہ کون سا اُردو داں ہے، جو فارسی ادبیات کے چہرہ مہرہ، خدوخال، رنگ روپ سے آشنا نہیں۔ شاہنامہ نہ بھی پڑھا ہو تب بھی کان میں صبح سے شام تک سیکڑوں آوازیں پڑی ہوں گی۔ تاریخِ ایران سے کماحقہ واقف نہ بھی ہو تو سر زمین ایران کے قصّے سُنے ہوں گے۔

اس لحاظ سے اس تمثیل میں ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے اور کم سے کم دو چار مشہور نام وہ آجاتے ہیں جو دلچسپی سے بیدریغ خراج حاصل کرتے ہیں، اور توجہ کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اس پر افسانے کا مسلّم طور پہ قدیم ایرانی اور یونانی تاریخ کے ایک فیصلہ کن اور اہم ترین واقعہ اور زمانے سے تعلق رکھنا دل کشی کا ایک ایسا سامان مہیا کر دیتا ہے جس سے نظر کا خریدار کہیں بچ کر نہیں جا سکتا۔

یہ چند سطریں تمہید کے لیے کافی نہیں۔ مگر یہاں سے اب ایک دوسرا مرحلہ شروع ہونا لازمی ہے اس تمثیل کی اتنی ہی روشناسی کافی نہیں۔ کچھ

اس سے زیادہ حالات پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ میدان طلب و تحقیقات تو بہت وسیع ہے اور زنجیر کی کڑیاں ملانے اور جوڑنے کے لیے قدیم یونان اور ایران بلکہ اس دور اور زمانے کی گرد و پیش کی دُنیا کی مختصر تاریخ تمدن، طرزِ معاشرت، رفتارِ تخیل، حلیۂ ادبیات، چہرۂ علوم و فنون وغیرہ بہت سے میدان ہیں جن کی سرسری طائرانہ سیر دل چسپی سے خالی نہ ہوگی مگر اس اُڑتی ہوئی نظر کے لیے بھی ساز و سامان کی ضرورت ہے۔ خیر اتنی لمبی منزل مارنے کی تو ضرورت نہیں مگر کچھ موٹی موٹی باتیں اگر بیان کر دی جائیں تو ایک دُھندلا سا خاکہ ضرور سامنے آ جائے گا۔ جو اس تمثیل کا پس منظر بن سکتا ہے۔

شاید اس محل پر یہ ظاہر کرنا مناسب ہے کہ ترجمے کے نقش و نگار مرتب کرنے میں کن کن امور کا لحاظ رکھنا پڑا۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں خیالات کو منتقل کرنا کچھ بھی دشوار نہ ہوتا اگر کوئی ایسا ذریعہ نکل آتا کہ خیالات کی ایک ایسی تصویر بنائی جایا کرتی جسے ہر زبان والا دیکھتے ہی اپنی زبان میں ادا کر سکتا۔ فطرت یا کائنات کا یہی طریقہ ہے۔ فطرت پھول، اوس، پانی، دھوپ وغیرہ وغیرہ ہر اس حقیقت ظاہری کو جو محسوس ہو سکے ہر محسوس کرنے والے کے سامنے ایک ہی شکل میں پیش کرتی ہے اور دیکھنے سننے والے کو اختیار ہے کہ وہ اسے جس زبان کا چاہے جامہ پہنائے۔ اگر تمام دنیا قدیم مصریوں، چینیوں یا جاپانیوں کی طرح خط تصویر اختیار کر لیتی تو ایک حد تک ایک زبان سے دوسری زبان تک خیالات کا سفر آسان ہو جاتا۔ ابھی تک وہ آئینہ نہیں بنا جس میں دل کا عکس آ جائے اور اس لیے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر زبان

کے نقش ونگار جدا ہیں۔ صرف لب ولہجہ، مخارج اور آواز کے اُتار چڑھاؤ کا معاملہ ہوتا تو بھی نقل اتنی دشوار نہ ہوتی۔ آخر گیتوں کی نقل ہوتی ہی ہے۔ مگر جہاں لفظ دل کے خیالات کا قائم مقام ہو اور پھر خیالات کی ترتیب بھی مختلف ہو، اور کل عمارت غلط بنیادوں پر اُٹھے اور بالکل الگ قسم کے مکان بنیں تو اس سب کا ایک دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل کے نقش ونگار بھی قائم رہیں اور نئے لباس میں اجنبی بھی نہ معلوم ہوں، ایک مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ چنانچہ ہر زبان دوسری زبان کے خیالات کو اپنے پیمانے میں ڈھال لینے پر مجبور ہے۔ اس تمثیل کے ترجمے کے سلسلے میں تین دشواریاں پیش آئیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اصل تمثیل یونانی زبان میں نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور انگریزی میں بھی نثر میں نہیں بلکہ نظم میں۔ گویا اصل نے حقیقت میں تین قالبوں میں حلول کیا یونانی نظم سے انگریزی نظم میں دو قالب ہو گئے اور پھر اب انگریزی نظم سے اُردو نثر میں تیسرا قالب ہوا اور بالآخر نثر کو نظم کیا اس چہار آتشہ تبدیلی میں نہ معلوم جو عطر کھنچا اس میں اصل پھول کی بھینی خوشبو تیز ہو گئی یا تیز خوشبو ہلکی رہ گئی۔ رہا پھول کا رنگ روپ تو یہ ظاہر ہے کہ وہ باقی نہیں رہا۔ صرف خوشبو سے جو اندازہ ہو سکتا ہے وہ حاضر ہے۔ موجودہ زمانے کے یونانی عالموں کا بیان ہے کہ زبان بڑی مرصّع ہے۔ مغربی زبانوں میں انگریزی کو خصوصیت کے ساتھ سادگی اور جچے تُلے اندازِ بیان پر ناز ہے اور اُسے زیوروں اور کارچوبی تلاؤ جوڑوں سے گھن آتی ہے۔ چنانچہ باوجود انتہائی رواداری کے انگریزی زبان میں یونانی کا ننگا بوچارہ جانا ایک قدرتی بات ہے۔ اس کی ایک یہ مثال ہے کہ کوئی دُلھن چوتھی کا جوڑا

پہن کے کہیں مہمان جائے اور میزبانوں کے یہاں غمی کا موقعہ ہو جائے تو بیچاری اپنا جوڑا اُتار وہیں گھر والوں سے سیدھے سادے کپڑے مانگ کے پہن لے گی۔ اگر ہندوستان کے راجہ مہاراجہ اپنے زرق برق لباس میں لندن یا نیویارک کے بازاروں میں پھریں تو یا تو نکو بن جائیں یا تماشہ اور لوگ کھڑے ہو ہو کر گھور گھور کے دیکھنے لگیں اور آخر مجبوراً انھیں ان ہی دلیسوں کا لباس پہننا پڑے۔ انگریزی زبان کا قد و قامت اس تمثیل کے مترجم پروفیسر بلیکی کے قول کے مطابق یونانی زبان کے زربفت اور کمخواب کا متحمل نہیں ہو سکتا مگر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر انگریزی میں سے یونانی بالکل نچوڑ کے نکال دی جائے تو جو کچھ باقی رہے گا وہ بڑا ہی پھیکا ہوگا۔

پروفیسر بلیکی نے اپنے ترجمے میں جو آج سے پچانوے برس پہلے شائع کیا گیا، ترجمے کی تمام دقتوں پر پوری بحث کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے اس وقت تک جتنے لاطینی، جرمن اور انگریزی نثر اور نظم میں ترجمے ہو لیے تھے انھیں اصل کے صحیح نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد اور تمام مباحث اور متنازعہ فیہ مطالب پر غور و غوض کر کے ایک آخری فیصلہ کیا اور حتی المقدور اصل سے تجاویز نہیں کیا۔ بجز ان مقامات کے جہاں محض عروض و وزن نے مجبور کر دیا، جہاں انگریزی زبان اصل کے لفظ بہ لفظ ترجمے کی متحمل نہ ہو سکی۔ پروفیسر بلیکی کے سامنے متعدد ترجمے تھے جن میں سے (POTTER) کا ترجمہ بھی تھا جو ۱۷۷۷ء میں طبع ہوا تھا اور جسے امریکہ کے ایک حلقے میں خاص مقبولیت ہے۔ یہ ترجمہ میرے بھی پیشِ نظر ہے اور پورے غور کے بعد میں نے بلیکی کے ترجمے کو قابلِ ترجیح تصور کیا۔ کیونکہ پوٹر نے جہاں تک میں نے اندازہ کیا یونانی انداز بیان کے قریب رہنے کا خیال قابلِ ترجیح نہیں سمجھا۔

دوسرا مسئلہ بلیکی کے ترجمے کا منظوم ہونا ہے۔ مجھے خود منظوم ترجمہ دیکھ کے تامل ہوا۔ اور اس ترجمے کی طرف خیال گیا جو شوبینر نے نثر میں کیا ہے۔ مگر اس موقع پر اس کا دستیاب ہونا بھی دشوار ہے (میں قلعۂ احمد نگر میں نظر بند ہوں) اور دستیاب ہو بھی جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ معاملہ کچھ بہت زیادہ سلجھے گا بھی نہیں۔ اصل اصل ہی ہے اور اس کا سامنے ہونا پھر ایک معنی رکھتا ہے۔ اصل کو چھوڑ کر ہر اعتبار سے باوجود ان تمام دشواریوں کے جن کا سرسری ذکر اوپر ہوا، بلیکی کا ترجمہ پھر غنیمت ہے کیونکہ اس مترجم کی نگاہ بھی وسیع ہے اور دل بھی قوی ہے کہ اس نے اپنے ترجمے میں اصل کا بڑا لحاظ رکھا ہے اور جہاں کہیں شبہ گزرا ہے اس پر ایک مناسب یادداشت قلمبند کر دی ہے جس سے گنجلک دور ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ پورا اطمینان ہے کہ اگر کسی متجسس طبیعت کو اصل سے اس ترجمے کے مقابلہ کرنے کا موقع میسر ہو تو غالباً اصل ترجمے میں زیادہ فرق نہیں ملے گا۔ بلیکی اور پوٹر کے ترجموں کا مقابلہ اس امر پر کافی روشنی ڈالتا ہے اور بلیکی کو ترجیح دینے سے گونہ تسکین ہوتی ہے۔

رہا معاملہ نظم کا، اس بارے میں یہ جتا دینا ضروری ہے کہ یونانی اوزان اور انگریزی اوزان میں خود انگریز مبصروں کی نگاہ میں کافی تفاوت ہے۔ مگر پھر بھی بعض اوزان یونانی اور انگریزی کے قریب ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یونانی عربی اور فارسی اوزان کے مقابلے میں کیا حال ثابت ہو۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اردو جتنی فارسی، عربی اور ہندی اوزان کی متحمل ہو سکتی ہے اتنی انگریزی کی نہیں ان دونوں کی نظم اور عروض میں اتنی ہی مغایرت ہے جتنی ہندوستانی اور مغربی موسیقی میں۔ دونوں بالکل دوسری بنیادوں پر قائم ہیں۔ مگر جس قدر اندازہ انگریزی علما و فضلا کی شرح سے کیا جا سکتا ہے غالباً یونانی اور فارسی اوزان و عروض

ایک دوسرے سے بہت زیادہ بعید نہیں۔ اور ممکن ہے کہ بعض بہت قریب ہوں۔ بہر صورت ایک معاملے میں تو یونانی عربی اور فارسی عروض و بحور یکساں ہیں اور وہ یہ کہ خاص خاص موقعوں اور خاص خاص خیالات کا اظہار کرنے کے لیے بحور کی اقسام جُدا ہیں۔ رزمیہ و بزمیہ، قصیدہ و مرثیہ، غزل و رباعی، مثنوی وغیرہ اصنافِ شاعری کے لیے جدا جدا بحور اور اوزان مخصوص ہیں۔ انگریزی اس پابندی سے بڑی حد تک آزاد ہے۔ مگر ہاں رنج اور خوشی وغیرہ کے مواقع کے لیے انگریزی میں ایک حد تک خاص بحور کو ترجیح دیتے ہیں۔ بلیکی نے اس پابندی سے معذوری ظاہر کر کے اپنا معاملہ صاف کر دیا ہے اور کم سے کم اس ایک پابندی کے ہٹ جانے سے ترجمے میں اصل سے بہت، زیادہ تجاوز کرنے کا میدان وسیع نہیں رہتا۔ پھر بلیکی نے قافیے کی پابندی اور کہیں کہیں ترکیب بند استعمال کرنے کے معاملے کو بھی پوری دیانت سے صاف کر کے ان مقامات پر روشنی ڈال دی ہے جہاں ضمنی تفاوتِ لفظی و معنوی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر اس نے اس تنوع کے دامن کو بھی حتی الامکان تنگ رکھا ہے۔

موجودہ اُردو ترجمے کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔ بلیکی نے اپنے سامنے یہ معیار رکھا کہ ترجمہ کرتے وقت اسے یہ خیال نہ رکھنا چاہیے کہ اگر ایسکلس انگریز ہوتا تو کس طرح اپنا مفہوم اور مطلب ادا کرتا اور اس لیے اصل کا ترجمہ انگریزی میں اس طرح ہو کہ خود ترجمہ انگریزی میں اصل تصنیف معلوم ہو، بلکہ انگریزوں کو ایسکلس کے مطالب ہی نہیں بلکہ اندازِ بیان کا بھی پورا اندازہ ہونا چاہیے اور ترتیب خیال و الفاظ اصل کے قریب سے قریب رہے اور ہمیں اس کے اس دعوے کو صحیح ماننا چاہیے۔ میں نے

اس ترجمے میں انگریزی کے اتنے ہی قریب رہنے کی کوشش کی ہے جتنی بلیکی نے یونانی سے۔ مگر باوجود اس کے لفظی ترتیب انگریزی اور اُردو کی کسی حال میں ایک ہونی ممکن نہیں۔ شاید کہیں کہیں کوئی ناقابلِ توجہ فرق ہوا ہو تو ہو، ورنہ جہاں تک بن پڑا ہے میں نے ترجمہ انگریزی کی لکیر نہیں چھوڑی۔ بارہا جگہ جگہ موقع آیا ہے کہ مفہوم کا تقاضا ہوا کہ محاورہ، رواج، اور فارسی طرزِ ادا کو ترجیح دی جائے اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ ناممکن ہے کہ اصل یونانی ہو بہو، حرف بہ حرف وہی نہ ہو جو فارسی اور فارسی کے واسطے سے اُردو میں ہے۔ مگر انگریزی سے تجاوز کرنے میں تامّل ہوا اور وہ عبارت جو بالکل اپنے موقع و محل سے رنگین فارسی طرزِ ادا یا رنگین اُردو میں بہ آسانی رنگی جا سکتی تھی اسے کہیں روکھا پھیکا، کہیں سوکھا چھوڑ دینا پڑا۔ اس پر بھی جو نتیجہ مترتب ہوا وہ ثابت کرتا ہے کہ یونانی دسترخوان کے جن کھانوں کو انگریزی مذاق مرغن اور ثقیل تصوّر کرتا ہے وہ ہماری وہی دال روٹی ہے جو غریب سے غریب بھی روز کھاتا ہے۔ فارسی اور اُردو میں جن فقروں، محاوروں، استعاروں، تشبیہوں اور طرزِ بیان کو محض تہذیب و شائستگی کا لازمہ قرار دیا جاتا ہے اسے انگریزی مشرقی مبالغہ، ثقالت اور تکلف تصوّر کرتی ہے اور سادگی اور حقیقت کے اظہار کے گلے میں مہمل سرائی کا طوق گردانتی ہے مثلاً اردو دال شائستہ طبقے میں لڑکے کو، قرۃ العین، نورِ بصر، نورِ نظر، برخوردار، نورِ چشم، لختِ جگر، دل بند وغیرہ لکھنا صرف "بیٹا" لکھنے کے برابر ہے اور ماں تو روز اور ہر وقت میرے لعل، میرے چاند، میری جان وغیرہ لفظوں سے پکارتی ہی ہے مگر انگریزی میں یہ طرزِ تکلّم بالکل بے جا اور ناممکن ہے یعنی اگر مانیے کہ ان لفظوں کا انگریزی ترجمہ کرنے بیٹھے تو شاید بطور ایک اعجوبۂ روزگار نمونے

کے ضرور کہیں لفظی ترجمہ کر دے، ورنہ الف سے ے تک ہر موقع پر ماسوائے عزیز اور عزیزم کے نرا "بیٹا" لکھتا چلا جائے گا۔ اور کچھ لکھے گا بھی تو اس پر وہ اتنا ہی گراں گزرے گا جتنا اس کے برعکس ہم پر گنواروں کی زبان میں بیٹا بیٹی کو "چھورا، چھوری" کہنا گزرے۔ خیر غرضیکہ اسی اعتبار سے اُردو ترجمے میں یہ اندازہ ہوا کہ غالباً یونانی اصل اُس طرزِ بیان اور عبارت آرائی سے قریب تر ہو گی اور عجب نہیں کہ ہو بہو وہی ہو جس کا چہرہ فارسی کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے۔

اسی امر کو پیشِ نظر رکھ کر، باوجود اس کے کہ جی چاہتا تھا کہ فارسی اور عربی الفاظ جتنے کم ہو سکیں استعمال کیے جائیں، جو بہت آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ مگر موقع و محل اور خصوصاً اس آب و ہوا نے جو اس تمثیل کا تاریخی واقعہ پیدا کر دیتے ہیں، مجبور کیا کہ مناسب حال زبان اختیار کی جائے۔

جہاں میں نے معنی اور مفہوم کو پورے طور سے محفوظ رکھنے اور جوں کا توں رکھ دینے کی کوشش کی ہے، وہیں ایسے موقعوں پر جہاں محاورہ آگیا باوجود انتہائی خواہش کے کہ اپنی زبان کے محاورے کو ترجیح دی جائے میں نے اصل سے تجاوز نہیں کیا۔ مثلاً ایک موقع پر آیا ہے "مصیبتوں کا سمندر اُمنڈ آیا"۔ یہ اصل ترجمے کا بجنسہ ترجمہ ہے۔ یہاں اگر مجھے آزادی ہوتی تو میں "مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا" لکھنے میں تامل نہ کرتا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ یونانی جو ساحل کے قرب و جوار میں رہتے تھے اور جنھیں دن رات سمندر، طغیانی، طوفانِ باد، موجوں کے اُتار چڑھاؤ سے کام پڑتا تھا قطعی ہر مصیبت کی طغیانی کے موقع پر سمندر کا استعارہ استعمال کریں گے اگرچہ شاید ایرانی جو وادیوں اور پہاڑوں سے زیادہ دوچار تھے، خشکی کے

حوادث سے استعارہ طلب کریں گے۔ مگر یہاں مسئلہ صرف یہ نہیں کہ ہم کیا کہیں یا ایرانی کیا کہتے ہیں بلکہ ایسکلس یونانی نے کیا کہا۔ مگر دو موقعوں پر میں نے اصل ترجمے سے تجاوز کیا ہے۔ ایک تو محض مناسبت حال اور دوسرے شائستہ مقال کے موقعوں پر میں نے جہاں ترجمہ تُو تکار جائز رکھتا ہے (جو شاید اصل یونانی سے لیا ہوگا یا شعری ضرورت سے استعمال کیا ہوگا) اور دوسرے جہاں کھلے دربار میں یا نیاز نذر کے ایک عام مجمع میں اردشیر کی ماں ایران کی معمر ملکہ اپنے بیٹے کا ذکر کرتی ہے یا اپنے عالی جاہ شوہر دارا کی روح سے مخاطب ہوتی ہے۔ ان موقعوں پر میں نے تُو تکار چھوڑ کر مناسب حال مہذب انداز تخاطب اختیار کیا ہے اور "تو" کی جگہ "آپ" اور "آپ" کے اعتبار سے "خیال فرمائیں" اور اسی قسم کے مناسب لفظ استعمال کیے ہیں جو صاحب اس کو جائز نہ قرار دیں وہ "آپ غور فرمائیں" کی جگہ "تو سوچ لے" پڑھ لیں۔ اسی طرح میں نے اردشیر کی ماں اور درباریوں کی گفتگو اور اسی قسم کے موقعوں پر جہاں ترجمہ نے صرف "میرا بیٹا" یا "تیرا بیٹا" جائز رکھا ہے، وہاں اقتضائے کلام اور مقتضائے آداب شاہی سے "میرا نورِ نظر، لختِ جگر وغیرہ" یا "آپ کے فرزند، آپ کے دلبند وغیرہ الفاظ مناسب سمجھے ہیں۔ باقیماندہ ترجمے میں حتی المقدور سر مو فرق نہیں آنے دیا اور محاورات، تشبیہات، استعارات اور خصوصاً ان تمام چیزوں کو جن میں خواہ یونان یا ایران کے طرزِ معاشرت وغیرہ کی جھلک ہے بجنسہ رکھا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جہاں ترجمہ انگریزی ایک ہی تقریر یا ایک ہی موقع پر ایک فقرے میں ماضی اور دوسرے میں حال دکھاتا ہے میں نے حالت اور موقع و محل کے اعتبار سے اس ترکیب کو لفظی جامہ پہنانے سے اجتناب کیا ہے۔ مثلاً اردشیر کی یونانی مہم کا خاکہ کھینچتے ہوئے اور یہ دکھاتے

ہوئے کہ اس مہم میں کون کون شریک ہیں، ابتدائی منظر میں طائفہ اداکاران یہ کہتے ہیں کہ فلاں اور فلاں شریک مہم ہیں، ماضی پر جا گرتے ہیں اور اس واقعہ کا جو جاری ہے اس طرح ذکر کرنے لگتے ہیں کہ گویا وہ ایک گزرے ہوئے زمانے کا واقعہ ہے۔ میں نے یہ ظاہر کر دیا کہ ایسے موقعوں پر "تھا" اور "ہے" یا "تھے" اور "ہیں" کا تفاوت مقابلے سے ضرور ملے گا۔ مابقی ترجمہ اصل ترجمہ انگریزی سے اتنا ہی قریب رکھنے کی کوشش کی ہے جتنی امکان میں تھی اور میں انکسار مشرقی سے تجاوز کر کے یہ بھی کہوں گا کہ میں اپنی رائے میں "پارسی" کا ترجمہ پیش کرنے میں ناکامیاب نہیں رہا۔ مگر اس کی گنجائش ہمیشہ باقی ہے کہ اس سے بہتر نمونہ اور بلکہ خاص اصلی یونانی سے ترجمے کا نمونہ پیش ہو۔

ایک اور سنگ گراں ناموں کا مقابلہ

اس ترجمے کی راہ میں ایک سنگ گراں اور شاید ایک اعتبار سے سب سے گراں یہ تھا کہ یونانیوں ہی پر کیا منحصر ہے قریب قریب سب زبانوں کا یہ حال ہے کہ جہاں انھوں نے اپنی خاص قلمرو سے قدم یا قلم باہر نکالا اور جو نام ملا اس کے ناک کان کاٹے یا اس کی دم میں ایک پچھلا باندھا اور اصل صورت مسخ کر کے حلقہ بگوش غلام بنا لیا اور یہ ایک ایسی آسان اور بے زحمت فتح ہے کہ خود مفتوح اقوام اور ممالک بھی اپنے فاتح پر اس راہ سے ایسا چھاپا مارتے ہیں کہ خبر بھی نہیں ہوتی اور جب یہ معاملہ ایک ایسی قوم کی زبان سے متعلق ہو جو اپنی زبان، اپنے علوم و فنون، اپنی تہذیب کی فوقیت پر نازاں ہو اور وہ ناز غرور اور تکبر کی حد تک پہنچ جائے تو جو درگت دوسری قوموں

کے ناموں اور زبانوں، اور طریقِ معاشرت وغیرہ کی ان کے ہاتھوں ہوتی ہے اس کا تو پوچھنا کیا۔ سفید سیاہ اور سیاہ سفید ہو جاتا ہے، چہرہ مہرہ ایسا بگڑ جاتا ہے کہ خود اس زبان تہذیب اور ناموں کے مالک بھی بغور دیکھیں تو پہچاننے سے قاصر رہیں۔ یونانیوں نے جو حال ایرانی اور اس زمانے کی دوسری اقوام کے ناموں اور تہذیب و تمدن کے نقشوں کا کیا وہ تو بیان سے باہر ہے۔ اس زمانے کی دنیا کا ایک مختصر سا خاکہ آگے پیش کیا جائے گا اور جہاں جہاں یونانیوں کی دست بُرد نے اسے مسخ کیا ہے اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ یونانیوں نے جس قدر ایرانی، ایشیائی اور مصری نام ماسوا ان ناموں کے جو براہ راست یونانی الاصل تھے مثلاً سراقیہ (تھریس) یا ایشیائے کوچک کے ان مقامات سے متعلق تھے جو حقیقت میں قدیم یونانی مشرقی نوآبادیات تھیں، باقی اور سب کو یونانی رنگ و روپ دے دیا اور اب ان کا پہچاننا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ پھر ادھر دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ زمانۂ وسطیٰ اور حال کے ایرانی خود بھی اپنی قدیم تاریخ کو کھو بیٹھے۔ اور اب جو بھی پتہ نشان علمی تحقیقات، سکّوں، سُریانی، اکادمی، سُمیری، کلدانی، رباعی و دیگر اقوام کے آثار قدیمہ کے کتبوں اور اِدھر اُدھر کے یہودی صحیفوں میں یا اسی دَور کے ہمسایوں کے حال اور ٹوٹی پھوٹی تاریخ یا باختر اور مصر قدیم کے ان حالات اور تاریخ سے (جو رفتہ رفتہ استقلال اور صبر کی نگاہ پرانے کھنڈروں اور راکھ کے ڈھیروں میں سے کرید کرید اور کھود کھود کے نکال رہی ہے) ملتا اور مہیّا ہوتا ہے وہ بھی سب غیر ملکوں کے مغربی مستشرقین اور محققین کی جستجو اور تلاش کا نتیجہ ہے اور اس وجہ سے جہاں تک اصل مخارج و اصوات کا تعلق ہے وہ بجا طور پر بحث طلب بن جاتی ہیں

اور وہ اس لیے کہ براہ راست تو اتنی مدت گزر جانے کے بعد کون صحیح تلفظ کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ خود اس کی زبان میں بعض حروف کا تلفظ اور صوت بالکل جُدا ہو یا بعض حرف موجود ہی نہ ہوں اور اُن کی آوازوں سے اس کے کان آشنا ہی نہ ہوں۔ مثالاً اگر قابل سے قابل عرب یا ایرانی محقق سنسکرت کے اُن حروف کی اصوات کو آج بھی دوہرانے کی کوشش کرے جو اس کے یہاں موجود ہی نہیں تو وہ قطعی ناکام رہے گا۔ کجا یہ کہ اگر ہندوستان میں سنسکرت کے جاننے والے قطعی مٹ جاتے (جیسا کہ ان قدیم قوموں کا حال ہوا جن کے آثار اور جن کی مرحوم زبانوں کی ہڈیاں آج کھودی جا رہی ہیں) تو بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا محقق بھی انتہائی دیانت داری سے کام لینے کے باوجود سنسکرت کے لب ولہجہ اور تلفظ کا صحیح اندازہ لگا سکتا۔

یہی حال دری اور اُس ایرانی دور کے ناموں کا ہے جو اب صفحۂ ہستی پر صرف بے زبان تصویر یا گھسے ہوئے یا مٹے ہوئے دھندلے خاکوں کی طرح رہ گئے۔

اس قفلِ ابجد کو کھولنے کا بڑی تندہی سے اہتمام کیا گیا ہے اور مغربی محققین نے کوشش کر کے اصل کو زندہ کرنے کی سعی کی ہے مگر بہت بڑا ذخیرہ جس نے ابتدائی مہمات کے طے کرنے میں مدد دی ہے خود یونانی تاریخ اور یونانی ادبیات میں عزلت گزیں ہے۔

اب اس تمثیل میں ایسکلس نے علاوہ ان چند مشہور ناموں کے جو تاریخ میں نمایاں ہیں اور جو بدقسمتی سے جس شکل میں رونما ہوئے ہیں وہ خود نقاب پوش ہے اور جتنے نام گنوائے ہیں وہ انسان کو بھول بھلیاں میں لیجا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

اس سمندِ ناز پر انگریزی کا تازیانہ اور بھی پریشان کر دیتا ہے تمام مغربی زبانوں میں (صرف انگریزی اور چند شمالی یورپ کی زبانیں چھوڑ کر جو جرمن کے خاندان سے متعلق ہیں) یونانی، لاطینی سمیت ایک زبان ایسی نہیں جس میں مثلاً ڈال اور ٹے ہو۔ بعض میں جیم کی آواز بالکل غائب ہے، بعض میں خ سے واسطہ نہیں، خود انگریزی خ سے ناآشنا ہے اور ت اور د کی آوازوں سے ناواقف ہے۔ ان حالات میں انگریزی کے یونانی اور لاطینی تلفظ پر اعتماد کرنا فعل عبث اور گمراہی کا پہلا دروازہ ہے۔ بالآخر تمام اونچ نیچ پر نگاہ ڈالنے کے بعد قرینِ مصلحت یہی نظر آتا ہے کہ علاوہ معروف ناموں کے جو عربوں کے واسطے سے سامنے آگئے ہیں، یا جن کو موجودہ اور قدیم فارسی اور ایرانی ادب یا مذہبی یعنی زردشتی کتب مقدسہ یا جن کی قریبی شکلوں کو فردوسی نے متعارف کر دیا ہے، انسان محض قیاس سے کام لے اور ہر ایشیائی نام کی یونانی صورت کو معرّب یا مفرّس کر لے اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

چنانچہ میں نے اسی اصول پر عمل کیا ہے اور جہاں شبہ رہ گیا ہے وہاں معرّب یا مفرّس کرنے کے اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اگرچہ مصری ناموں کو ایک حد تک اس دائرے سے ممتاز رکھنے کے لیے جہاں عرب ط، ص اور ق سے کام لیتے، وہاں میں نے ت، س اور ک سے کام لیا ہے منظوم ترجمے میں مَیں نے اصل یونانی سے بھی ناموں کا مقابلہ کر کے قریب ترین اصوات اختیار کی ہیں۔

اگرچہ شاہنامے میں اس تاریخی دور کا ایک واقعہ نظر نہیں آتا۔ مگر بعض نام شاید خود نظر آتے ہیں۔ اس مشابہت سے قیاس کو قدرے امداد ملتی ہے مگر نہ اتنی کہ پورے تیقن سے خاص خاص ناموں کو اختیار کر لیا جائے۔

ایران کے یونانی معرکے کا شاہنامے میں کہیں براہِ راست ذکر نہیں مغربی دنیا کا جہاں تذکرہ ہے وہ " روم " کے عام لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہیں بلغار (غالباً بلغاریہ) کا ذکر ہے۔ یا پھر تمام قصّہ " توران " اور ایران کی لڑائیوں کا افسانہ ہے۔

مطابقت حالات کے لحاظ سے جہاں جہاں اشتباہ ہوتا ہے وہاں ناموں اور تفصیلی کارناموں کے اختلافات اُلجھنیں اور بل ڈال دیتے ہیں اور تاریخی واقعات کا اختلاف بدستور قائم رہتا ہے اور ناموں کی مطابقت عنقا ہوجاتی ہے۔

ایسکلس

ایسکلس اثنیہ (ایتھنز) کے ایک شریف قدیم اور نام آور خاندان سے تھا۔ ۵۲۵ قبل مسیح یا یوں کہا جائے کہ دارائے اعظم کے دور میں پیدا ہوا۔ دارا اور اردشیر کے معرکوں میں اثینیہ کے غنیم میں شریک تھا، وہ بھی اور اس کا بھائی بھی۔ اور اسی وجہ سے اس کے دماغ نے اردشیر کے بحری حملے کی ناکامی کو یونانی تفاخر کا ایک ایسا اہم معرکہ تصور کیا کہ اس نے اسے زندہ جاوید بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ تمثیل معرکۂ سالامیس کے آٹھ برس بعد تصنیف ہوئی۔

ایسکلس کے پورے حالات اور سوانح عمر نسبتاً کمیاب ہیں مگر جو دستیاب ہوئے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ ابتدائے سنِ شعور سے اس کی طبیعت ادبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بیس برس کی عمر کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک تاکزار کی سیر کے دوران میں اس نے بہار اور میگساری کے دیوتا دیونیسیوس کو دیکھا اور خود اس دیوتا نے اسے ہدایت کی کہ تو ہماری شان میں طبع آزمائی کر۔ چنانچہ اس دن سے ایسکلس نے اسے فال نیک سمجھا اور اس طرف متوجہ ہوگیا۔

واقعہ جو بھی ہو مگر اس سے اس کی طبیعت کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

یونان کا یہ زرّیں زمانہ تھا۔ یونانیوں کی دماغی، ادبی، روحانی اور جملہ بشری ترقی کا دور تھا۔ سبزہ زار اطیقہ (ایٹیکا) خصوصاً اور عام یونانی مرغزار، دماغی بہار کے متقاضی تھے، اور یونانی قوم اپنے عالمِ شباب میں خمار ہستی سے سرشار تھی۔

ایک طرف فلسفہ و حکمت، دوسری طرف فنونِ لطیفہ، تیسری جانب رزم و بزم کی گہما گہمی غرضیکہ سرزمینِ یونان اس وقت اس حیرت انگیز دور سے گزر رہی تھی جو یادگارِ زمانہ اور گل سرسبد روزگار ہوکر رہا۔ یونانی زندگی نذرِ خزاں ہوگئی، مگر یونانی تہذیب کا پھول رنگ و بو کی تبدیلی کے باوجود مغرب میں آج بھی کھل رہا ہے۔

یونان کے اُس دور میں قومی بیداری، جرأت و شجاعت کا سیلاب، اور آزادی کا سرور ذہنی حسّاسی، اور نُدرت خیال کی موجیں چاروں طرف سے اُمنڈ رہی تھیں۔ ہر قوم کا یہی وہ خوش نصیبی کا زمانہ ہے جو صلاحیت کی ناز و نعم سے پرورش کرتا ہے۔ ایسکلس کی خوش قسمی تھی کہ وہ اس زمانے میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ اور ایک ایسے دوَر میں اس کی دماغی اور ادبی بہار کے پھول کھلے کہ آج بھی تر و تازہ نظر آتے ہیں۔

پچیس برس کی عمر سے آخر دم تک وہ برابر ادبی مشغولیت میں سرگرم رہا۔ اس نے ادبی سرمایہ کافی چھوڑا تھا مگر دست بردِ زمانہ نے بہت کم باقی چھوڑا۔ یہ غارتگری صرف ایسکلس تک محدود نہیں بلکہ تمام یونانی ادبیات کو پیش آئی۔ اس دور میں مصنّف اور شاعر، حکیم اور صنّاع ہر ایک اپنی قوم اور وطن کی ہر جد و جہد میں پورا حصّہ لینا زندگی کا ناگزیر فریضہ اور کردار شہریت

کا فخر اور امتیاز مانتے تھے، سقراط اور ایسکلس دونوں اس دور کی زندگی کے ڈھانچے میں حکیم اور شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنے فرض قومی سے بے پروا نہیں رہے۔ جب کبھی معرکہ آرائی کی نوبت آتی تھی اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ایسکلس ان تاریخی معرکوں میں جنھوں نے روزگار پر نئے نقش ثبت کر دیئے، شریک تھا۔

مغربی تاریخ میں ماراتون (میراتھون) اور سالامیس وہ یادگارِ زمانہ معرکے ہیں جو ایرانیوں اور یونانیوں کے درمیان ہوئے اور جن کے نتائج پر اس کا دار و مدار تھا کہ مشرقی تہذیب کا پرچم یورپ کے براعظم اور گویا تمام دنیا پر چھا جائے یا مشرق کا سیلاب فتوحات درہ دانیال (انبائے ہیلیہ) میں گم ہو کر مشرق کے اقتدار اور رعب و داب کی کشتی ورطۂ باسفورس میں غرق ہو جائے اور مغرب حفاظت خودی کے حصار میں اپنی جدا تہذیب اور نئے اقتدار اور قوت کا علم بلند کرے۔

قسام ازل نے معرکۂ سالامیس کا سہرا یونان کے سر باندھا اور اگرچہ مشرق و مغرب کا مقابلہ فوراً یکسو نہیں ہوا، مگر مشرقی اقتدار نے جو چوٹ اس موقعہ پر کھائی، اس سے آج تک جاں بر نہیں ہوا۔ اس سے پہلے مغرب کو مشرق کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھنا تو درکنار اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ مشرقی اقتدار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں تامّل بھی کرے۔ لے دے کے تمام مغرب میں صرف خطہ اطیقہ جس کا دارالحکومت اثینیہ تھا ایسا تھا جو باوجود اس کے کہ اس کے ہمسائے ایران کے مطیع و منقاد یا دست نگر اور زیر اثر تھے اپنی آزادانہ زندگی پر فخر کرتا تھا اور خدیو خاور پادشاہ ایران کی اطاعت سے خود دارانہ غرور سے منحرف تھا۔

بہر کیف ایسکلس اس معرکہ میں خود شریک تھا جو "پارسی" کی بنیاد ہے۔ اس تمثیل میں اس نے واقعات جنگ کو کس درجہ مبالغہ اور قومی غرور کے رنگ میں بیان کیا ہے آگے ظاہر ہوگا۔ مگر یہ صاف ہے کہ اردشیر کی فوج کی پسپائی جو بحری ہزیمت کی وجہ سے پیش آئی صرف یونانیوں کے لیے نہیں بلکہ کل عالم مغرب کے لیے ایک ایسے فخر و مباہات کا طلائی موقعہ بن گئی کہ ایک ایسا قومی شاعر اور تمثیل نگار جو اپنے زمانے ہی کا نہیں بلکہ آج بھی اُستاد شمار ہوتا ہے اگر اپنے قومی وقار کو چمکائے اور مشرقی حملہ آوروں کے اقتدار قومی کو نسبتاً گھٹا کر دکھائے تو تعجب کا مقام نہیں۔

مگر اس تمثیل میں ایسکلس نے قدیم ایرانی زندگی، معاشرت، آدابِ رزم و بزم پر یونانی زاویۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور آج بھی باوجود ڈھائی ہزار برس گزر جانے کے ہماری آنکھوں کے سامنے سُوسہ اور ہمدان کے ایوان و شبستان شاہی، دربار کے امرا و شرفا، خوش نصیب اور بدقسمت خواتین اور نونہالانِ ایران، دلاورانِ ایشیا پیکارجویان باختر و مصر، ایران و توران، ایشیائے کوچک اور فنیقیہ، صُور و صیدا، سراقیہ (تھریس) مقدونیہ، حتیٰ کہ ہندوستان تک کے روسا، سلاطین، باجگزاران قلمرو ایران کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ اگر اس تمثیل میں کچھ اور نہ بھی ہو تو یہ کیا کم ہے کہ وہ ایک ایسے زمانے اور ایسے دور کی یاد تازہ کر دیتا ہے جو مشرقی حافظے سے ایسا محو ہوا کہ اس کا پتہ نشان باقی نہ رہا۔ ڈیڑھ ہزار برس بعد جب فردوسی نے قلم اُٹھایا تو قومی روایات اور حکایات کو قلم بند کیا تو اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ دارائے اعظم اور اردشیر جن کے نام یونانیوں کے قلب پر آج تک کندہ ہیں، اور جو مغرب کی نگاہ میں ایرانی

اقتدارِ شہنشاہیت کے مایہ ناز ہیں اور جن اسمائے گرامی سے یہودیوں کی کتب مقدسہ آج بھی خالی نہیں کون تھے کس کس زمانے میں ہوئے اور اور ان کے کیا کارہائے نمایاں تھے جو زمانے کے سینے پر نقش ہوئے۔ زمانۂ قدیم کے پُرہیبت شہریاروں کے جانشین اتنا بھی نہیں معلوم کر سکے کہ جس تخت و تاج پر انھیں ناز تھا کن عظیم الشان ہستیوں سے ورثے میں آئے تھے۔ یوں شاہنامہ کیومرث یعنی ایرانی مورث اعلیٰ سے لے کر آخر دور تک کی داستانِ پارینہ سے پُر ہے مگر اس دور کے واقعات و حالات سے سراسر خالی ہے۔

مشرق جس درجہ سرنگوں ہوا وہ اس طوقِ غلامی سے ظاہر ہے جسے زیب گلو کر کے مشرقی رعایا اور شہری تو ایک طرف مدعیان تاج و تخت اپنا زیورِ امتیاز اور سرمایۂ ناز کل تک گردانتے لگے تھے۔

مگر ایک وقت تھا کہ مشرق کے اقتدار کا کاخِ زرّیں فلک الافلاک سے باتیں کرتا تھا، گو بالآخر کاخ کسریٰ اور گنبد افراسیاب بوم و عنکبوت کے حوالے ہو گئے۔ تہذیب، تمدن، ترقی، شبابِ زندگی ڈھلتی پھرتی دھوپ چھاں ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ جہاں سورج کی پہلی کرن چمکتی تھی وہاں اب اندھیرا اور جہاں اندھیرا تھا وہاں روز فیروز بندی جلوہ گر ہے۔ خیر یہ تو آمدِ سخن ایک جملۂ معترضہ تھا۔ ایسکلس کی زندگی کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آخر زمانے میں مرنے سے دو برس بیشتر وہ یونان سے ترکِ وطن کر کے صقلیہ کے شہر کیلا میں چلا گیا تھا۔ پروفیسر بلیکی کا خیال ہے کہ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ جمہوریت نے اتنا زور پکڑا کہ ایسکلس اپنے قدیم دور کے خیالات اور زندگی کے نقشوں کو پیش کر کے عوام کو چنداں خوش نہ کر سکا مگر اوروں کا خیال

یہ ہے کہ وہ نوجوان ادیب سوفوکلیز کی شہرت اور ہر دلعزیزی سے دلگیر ہو گیا تھا۔ فیثاغورث کو بھی یہی منزل پیش آئی تھی اور بالآخر ترک وطن کر کے وہ اطالیہ میں چلا گیا تھا۔ مگر فیثاغورث کا معاملہ دوسرا تھا وہ صرف حکیم اور فلسفی ہی نہیں بلکہ نبوت کا مدعی تھا اور اس نے جس مذہب کی بنیاد ڈالنی چاہی وہ قدامت پرست اور اصنام پرست یونان کے مزاج کے سخت خلاف تھی اور بالآخر وہ تارک وطن ہو کے غربت ہی میں جاں بحق ہوا۔

فیثاغورث ایسکلس کا بھی ہیرو تھا یا کم سے کم وہ اس کی اخلاقی تعلیم کا قائل تھا اور اسے آزاد خیال معلّم اخلاق تصوّر کرتا تھا۔

ایسکلس کی تصانیف میں اخلاقی تلقین کا پہلو کافی روشن ہے۔ اور جس بلند پایہ معیار اخلاق کو وہ پیش کرتا ہے، اس میں نیکی و بدی، سزا و جزا کا عنصر شیرازہ بندی کا کام کرتا ہے۔

ایسکلس نے اپنے کلام اور تصانیف میں صرف اپنے زمانے اور اپنے دور کے نقش و نگار اور خیالات کو ہی نمایاں نہیں کیا بلکہ قدیم روایات کو اس کی تصانیف کا جزو اعظم گردانا چاہیے۔ خود اس کا اپنا قول ہے کہ "میں اُس ضیافت (کی نعمتوں) میں سے جو ہُمیرس نے تیار کی تھی، ایک ایک کر کے پیش کرتا ہوں"۔ یعنی ضخیم تصنیف کو جستہ جستہ اپنی تمثیلوں میں پیش کرتا ہوں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے ایک "پارسی" کو چھوڑ کر جو اس دور میں ایک تاریخی تمثیل ہونے کے لحاظ سے عدیم المثال تصنیف تھی باقی اور تمام تصانیف کی بنیاد ان ہی قصوں اور داستانوں پر ہے جو ہُمیرس اور ہیسیوڈ نے صدیوں پیشتر لکھ کر یونانی ادبیات کا گنج قارون جمع کر دیا تھا۔ چنانچہ ایسکلس کے جانشینوں نے جو آج مشہور استادوں میں شمار ہوتے ہیں یعنی سوفوکلیز اور اوریدیز

نے بھی وہی روش جاری رکھی، اور اگرچہ ارسطوفینس اور مینا ندیر نے اپنی راہیں الگ نکالیں اور تمثیل نگاری کی ایک دوسری صنف کو روبکار لائے مگر ایسکلس کی استادانہ حیثیت ان کی نگاہ میں بدستور قائم رہی بلکہ ارسطوفینس نے تو ایک حد تک اپنے ہمعصر اروپدیز کی جس نے باعتبار انشا پردازی، الم نگاری کو ایک بلند پایہ صنف ادب بنا دیا اور متقدمین پر بعض اعتبار سے فوقیت لے گیا، تضحیک اور ہجو کی ہے۔

ارسطوفینس حقیقت میں عدیم النظیر استاد گزرا ہے۔ اس کی تصانیف اپنی مثال آپ ہیں اور تمثیل نگاری میں مضحک افسانوں اور نقل کا معیاری نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اس نے ہجو کرنے میں نہ حکیموں کو چھوڑا ہے، نہ فلسفیوں کو۔ نہ فرماں روایان وقت کو نظر انداز کیا ہے نہ مشاہیر زمانہ کو۔ سقراط کی خاک اڑائی ہے اروپدیز کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ "مصلحان قوم" کی مٹی پلید کی ہے۔ مذہبی نقالی اور توہم پرستی کی دھجیاں بکھیری ہیں۔ غرضیکہ جس میدان میں اشہب ہجو کو تگ و تاز کیا ہے اور جدھر نکل گیا ہے گرد آباد کر کے نکلا ہے۔

ایسکلس ایک مرتبہ غالباً ۴۷۸ء اور ۴۶۷ء قبل مسیح کے دوران میں صقلیہ کی مشہور نوآبادی کیراکیوس یونان کے مشہور شعرا سیسمونڈیز، پینڈار اور باقیلیڈر کے ہمراہ کیراکیوس کے مطلق العنان فرمانروا ہائیرون کی دعوت پر گیا تھا اور وہاں اور اساتذہ کے ساتھ اس کی بڑی آؤ بھگت اور خاطر مدارات ہوئی تھی۔

ایسکلس کو اواخر زمانہ میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک دن وہ حاکم شہر کے روبرو "توہین مذہب" کے الزام میں لا کھڑے کیے گئے۔ وہ شخص جس نے

اپنے مقدور میں مذہب اور اخلاق کے بلند پایہ اصولوں کو اپنی تصانیف کا نفسِ ناطقہ قرار دیا ہو اس الزام سے متہم ہو تو حیرت کا مقام ہے۔ یہ تو کہا جاچکا ہے کہ ایسکلس فیثاغورثی تھا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مسلّم اور مجریہ مذہب پر توہین آمیز طریقے پر حرف گیری کرتا تھا۔ بلکہ حقیقت میں اس کے بعد ارسطوفینس نے تو مذہب کے نام پر جو اعمال اور توہمات جائز تھے ان کی اس بُری طرح درگت کی ہے کہ باید وشاید۔ آج بھی آزاد خیال سے آزاد خیال اتنی جرأت کرتے ہوئے تامل کرے گا۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ ایسکلس نے اُن اسرارِ سربستہ قبیحہ کی جو الیوسنی اسرار کہلاتے تھے ضرور مذمّت کی تھی اور الزام عائد ہونے پر اس نے بنفس نفیس اپنی صفائی پیش کی اور بالآخر بری ہو گیا۔

یہاں یہ مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ آخر یونانیوں کا مذہب تھا کیا؟ غالباً اس کا اتنا جواب کافی ہونا چاہیے کہ ایک اعتبار سے یونانی مذہب کا سانچہ اصنامی مذاہب سے جُدا نہ تھا۔ قدامت سے دیوتاؤں کی پرستش چلی آتی تھی اور بظاہر ان کے خدا، خداؤں کی ازواج، خدازادے اور خدازادیاں ہر لحاظ سے وہی انسان تھے جو یونان کی سرزمین میں بستے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ وہ غیر فانی تھے اور یہ فانی۔ ورنہ ان کی زندگی اور زندگی کے محرکات سربسر وہی یونانی زندگی بلکہ عام بشری زندگی کے محرکات تھے جو تمام عالم میں روزِ ازل سے جاری ہیں اور کام کرتے ہیں۔ عشق و محبت کی کہانیاں، رشک و حسد کا اضطراب، انتقام کے درد انگیز انجام، غصہ اور حرص کے افسانے، جنگ وجدال کی نفس پروری اور نفسیات کے نمونے وغیرہ وغیرہ کل معاملات انسانی نوعیت کے مگر غیر فانی پیمانے پر تھے۔ یعنی بادۂ زیست وہی تھا مگر

اگر انسان ایک جرعہ میں سرشار ہے تو ان دیوی دیوتاؤں کو خم کے خم بھی ناکافی تھے۔

خدایانِ یونان، ان کی ازواجِ مطہرات، ان کی حرمیں مُسترتین، ان کے خاندان، ان کے خدام، ان کی دوشیزگان، ان کے عیش و عشرت کے سامان، عشرت کدۂ کوہ اولمپیہ میں یوم ازل سے ابدالاباد تک کے لیے موجود تھے اور تمام کارگاہِ ہستی کے معاملات بالکل بشری معاملات کی طرح مجالسِ شوریٰ میں طے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی یہ غیر فانی بیچارے فانی الاصل انسانوں سے عشق، حسد، انتقام، بخشش وغیرہ اقسام کے معاملات بھی قائم کر لیتے تھے اور پھر ان کی الجھنیں اور پریشانیاں ہوتی تھیں۔ کبھی کسی فانی الاصل کو انعام حیاتِ جاوداں بھی عنایت ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی کفرانِ نعمت کی پاداش میں انتہائی اذیتیں بھی پہنچائی جاتی تھیں۔

اس خاندان خدایان یونان کا حقیقی مورثِ اعلیٰ جو بطن ازل سے ہویدا ہوا تھا قرونوس تھا، جس کو زمانۂ پیری میں اس کے لختِ جگر خداوند یوف نے معزول کر کے خود زمامِ کائنات اپنے دستِ آئین نواز میں لے لی تھی اور ایسکلس کے زمانے میں یوف کا دور دورہ اور دبدبۂ خدائی نصف النہار پر تھا اور آئین اخلاق کے احکام ناطق اسی بارگاہ سے نافذ ہوتے تھے۔ بایں ہمہ کہیں خدازادے کہیں خدازادیاں عشق کے پیچیدہ کارخانے تیار کر کے کھڑے کر دیتے تھے کہیں حرم سرا میں حضرت علیا سوکناپے کی جلن میں بیچارے فانیوں کو غارت کرتی تھیں۔ کبھی خدازادگان بلند مقام اقالیم ربانی کے پیچیدہ معاملات میں مداخلت فرماتے تھے۔ غرضیکہ ایک حیرت انگیز انسانی خاندان کا پورا نقشہ تھا۔ مگر انھیں میں بڑے بڑے پرہیزگار، تقدس مآب، نفس کش دیوی دیوتا بھی تھے

ان کی داستانیں رستمی ہفتخواں اور طلسم ہوشربا سے کم نہیں۔ اور انھیں افسانوں اور روایتوں پر پورے مذہب اور اخلاق کی استوار بنیاد تیار کی گئی تھی۔ ان افسانوں میں جمالی اور جلالی عناصر اعلیٰ پیمانے کے ہیں اور یہ امر قابلِ ستایش ہے کہ جلالی اور اخلاقی شان عرش بوس نظر آتی ہے وہیں جمالی شان حقیقت میں اتنی نمایاں، اتنی دل کش، اتنی جاذب اور اتنی عالم گیر ہے کہ آج بھی اس کے حسن آفریں اور جمال آگیں محرکات زلیست کا جواب نہیں۔ اس تین ہزار برس میں انسان نے حسن و جمال کی حیرت انگیز تصویریں پیش کی ہیں مگر یونان کے معیار پر سبقت لے جانے والا نمونہ ابھی پیش ہونا باقی ہے۔ گو اس میدان میں سبقت مصر قدیم نے کی اور یونان بھی اس معاملے میں مصر ہی کا مرہونِ منّت ہے۔ نیز اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ باوجود اُن تمام پیچیدگیوں کے جن کا ذکر ہوا اور باوجود ان پستیوں کے جو طبع و فطرت انسانی ہیں نفس ناطقہ کے ہمعنان ہیں، اخلاقی بلندی کا جو معیار یونان نے قائم کیا وہ اپنی ایک ممتاز اور نمایاں جگہ ہمیشہ قائم رکھے گا۔ مذاہب مختلفہ نے اخلاقیات کو سزا و جزا کے سانچوں میں طرح طرح ڈھالا ہے، مگر کل بلندیاں اور پستیاں جن کا حصار کیا ہے اسی فطرت انسانی کے ناگزیر مرقع ہیں جو سلف سے یکساں چلے آتے ہیں۔

ہم یہاں اس بحث کو جائز نہیں رکھتے کہ آیا اصنام پرستی مذاہب مختلفہ کی اخلاقی تعلیمات پر عموماً کیا اثر ڈالتی ہے۔ کیونکہ اس محل پر وہ بحث خارج القلم ہے مگر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ حکمائے یونان جنھیں ہر مذہب اور ہر مہذب قوم نے دانش اور فرزانگی کا نمونہ مانا اور اُستاد گردانا یونانی مذاہب کے اخلاقی پہلو پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ ہمیشہ کورانہ تقلید اور توہم پرستی کی اصلاح پر ان کی نظر رہی حتیٰ کہ افلاطون اور ارسطو نے بھی

" خداؤں" کے دربار میں ادب و احترام سے قدم رکھا۔ حکمائے یونان صرف اعمال اور کردار کی اصلاح اور خیال اور نیّت کی نفاست اور لطافت کے مدعی ہوئے۔

ایسکلس نے انہتر (۶۹) برس کی عمر میں انتقال کیا اور صقلیہ میں دفن ہوا، اہلِ گیلا کو اس پر ناز رہا اور بجا طور پر کہ تمثیل نگاری کے استاد الاساتذہ کی خاک ان کی زمین میں پیوست ہوئی۔

مرنے کے بعد اہلِ اثینیہ نے ایسکلس کو یہ عزّت بخشی کہ اس کی تماثیل اس کے انتقال کے بعد بھی مذہبی تیوہاروں کے موقعوں پر پیش کیے جانے کا اہتمام کیا گیا۔ کسی اور شاعر کو یہ عزّت نصیب نہیں ہوئی۔

یونانی تمثیل

باعتبار تحقیقات حاضرہ یونانیوں کو تمثیل نگاری کا موجد تصوّر کیا جاتا ہے۔ اور اس نسبت سے ایسکلس بانیِ تمثیل نگاری نہیں تو تمثیل نگاری کا وہ استاد ہے جسے خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور بہر کیف المیہ تمثیل نگاری کا تو وہ باپ مانا گیا ہے۔

سنسکرت ناٹک بھی قدیم ہے مگر اتنی نہیں کہ جتنی یونانی۔ گو شاید مزید تحققات اور انکشافات سنسکرت کے قدیم تر ناٹک دریافت اور ثابت کر دیں۔

سنسکرت کا قدیم ترین ناٹک غالباً مرچہ کٹکہ (یا مٹی کا رہڑو) ہے جو چارودت کے قلم نے صفحہ قرطاس پر مرتب کیا۔ محققین کے نزدیک یہ ڈراما آج سے اٹھارہ یا انیس سو برس بیشتر کا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے اس قسم کے ابتدائی نمونے نہ معلوم کس شکل و شباہت میں نمودار ہو کر " شعلۂ خس ہے یک نفس" کا نظارہ پیش کر کے غائب ہو گئے ہوں گے۔

یونان میں تمثیل نگاری کی ابتدا اس مزاج انسانی کے ازلی محرکات سے ہوئی جو فرصت حیات کو روحانی مزاج اور روحانی مزاج کو حقیقی تفریح کا زینہ قرار دیتا ہے یونان کی فرحت بخش آب وہوا، اور سرسبز وشاداب تاکزاروں اور مرغزاروں کا تقاضا تھا، اور ان کے مرز وبوم کی تین جانب سے بحری حصار کی برکت تھی کہ وہاں کے باشندے قلیل ہونے کی مزید خوش نصیبی سے اپنی زندگیاں ایک خوش وقت خاندان کی طرح بسر کرتے تھے۔ افکار معیشت وخور ونوش سے فراغت پا کے فرصت زیست کو روحانی دماغی، اور تفریحی مصروفیات میں صرف کرتے تھے۔ ایک اعتبار سے ہر قوم اور ملک کے باشندوں کو یہی دور زندگی پیش آتا ہے مگر وہ جنھیں فرصت اور مہلت زیادہ میسّر آجاتی ہے اور جنھیں ابتدائی زمانے میں نسبتاً بیرونی مداخلتوں سے گونہ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اپنی زندگیاں زیادہ جوش وخروش سے سلجھا اور سنوار سکتے ہیں۔ یونانیوں کو یہی خوش نصیبی حاصل ہوئی۔

موسموں کے اعتبار سے یونان میں (ایک حد تک قدیم ہندوستان کی طرح) دو موقعے ایسے آتے تھے کہ جب یونانی اپنے آپ کو کشمکش حیات سے فارغ پاتے تھے۔ ایک فصلیں تیار ہونے اور اٹھنے کے وقت یعنی موسم بہار کے خاتمہ پر دوسرے تاکزاروں کی تیاری پر جاڑے کی ابتدا یا وسط میں۔ اور چونکہ یونان کی خاص فصل کا ایک جزو انگور تھا جو مئے ناب کا خم اور سرور بکیراں کا بحر مواج اپنی شیریں اداؤں کے نقاب میں چھپا کر لاتا تھا۔ یہ تقاضائے فطرت انسانی تھا کہ یونانی اس موقع کو اپنی زندگی کی مہم کی قابل شکر فتحیابی تصور کریں اور عنایت ایزدی کا شکرانہ ادا کریں۔ چنانچہ اس موقع پر وہ خدائے بہار وئے یعنی دیونیسیوس کی خدمت میں نذر ونیاز گزرانتے اور

اس طور سے عید نو روز مناتے تھے کہ اس میں رقص و سرود، عیش و عشرت، سرور و خمار کی بزم آراستہ ہوتی تھی اور کئی دن تک رنگ رلیاں رہتی تھیں۔ اس میں دونوں مقصد پورے ہوتے تھے۔ عطائے ایزدی کا شکرانہ، ڈیونیسیوس کی پرستش اور فرصت کی مسرت و تفریح۔ اس موقع کو ہندوستان کی ہولی سے مشابہ سمجھنا چاہیے کہ ہفتوں پہلے سے بسنت اور بسنت کے بعد ہولی کی رنگ رلیاں چلتی رہتی ہیں، اور پھر اسے علاوہ عبادت اور نذر و نیاز کے رقص و سرود کا خاص موقع سمجھا جاتا ہے۔ اور بالکل اسی طرح جیسے کبھی ہولی پر سوانگ اور نقلیں، اور خاص دلینڈی کے دن ہر طرح کی چھوٹ اور تفریح خرافات ہوا کرتے ہیں۔ یونان میں بھی اس بہار کے تیوہار کے موقع پر ہر قسم کی تفریح کے سامان ہوتے تھے اور ان ہی میں سوانگ اور نقلیں اور مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ عرب جاہلیت میں بھی ایک تیوہار اور رنگ رلیوں کا زمانہ تھا جس کا نچوڑ مشاعرۂ عُکاظ تھا اور جس کی ادبی یادگار "مذہبات" ہیں یعنی وہ قصیدے جو مشاعرۂ عُکاظ میں اعلےٰ سمجھے گئے تھے اور جو بیت اللہ کے دروازے پر آویزاں کر دیئے جاتے تھے۔ یہی کیفیت یونان میں ہوتی تھی کہ اس موقع پر مشاعرے ہوتے تھے اور نقلیں اور سوانگ بھرے جاتے تھے جن کا ابتدائی محرک مذہبی اور روحانی اور محرک ثانوی تفریح اور تفنن طبع ہوتا تھا۔ دوسرے جاڑے کے تیوہار پر بھی اسی قسم کی عید اور ایک قومی تیوہار، میلہ اور رقص و سرود وغیرہ کا موقع ہوتا تھا۔

ایسکلس سے پہلے صدہا شعرا نے طبع آزمائی کی ہوگی اور کرتے تھے خود جب ایسکلس نے اس میدان میں قدم رکھا تو اس وقت یہ قاعدہ تھا کہ ہر شاعر جو اس ششماہی مسابقہ میں انعام کا اُمیدوار ہوتا تھا کم سے کم تین کھیل

یا نقلیں یا تمثیلیں پیش کرتا تھا جن میں سے ایک کا المیہ اور ایک کا مزاحیہ ہونا ضروری تھا۔ پھر نقاد اور مبصر انعام کے لیے ان میں سے تین چھانٹ کے تین درجوں میں رکھتے تھے یعنی اول، دوم، سوم صدیوں میں ادب کے ہزارہا نمونے ہوں گے جو پیش ہوئے ہوں گے اور سیکڑوں شعرا ایسے ہوں گے جنھوں نے امتیازی انعام پائے ہوں گے۔ مگر دست برد زمانہ نے ان سب شاعروں اور ان کی تصانیف کو نابود کر دیا۔

ایسکلس کو پہلی مرتبہ مقابلے میں شریک ہونے کے سولہ سال بعد پہلا انعام ملا، اور لطف یہ ہے کہ ان استادوں کی وہ تصانیف جو آج مشہور و معروف اور شہکار تصوّر ہوتی ہیں ان میں سے بعض انعام سے محروم رہیں! کون کہہ سکتا ہے کہ جسے ایک زمانے کے مبصر اعلیٰ مرتبہ دیتے ہیں اور دوسرے زمانے کے مبصر کس نگاہ سے دیکھیں گے! ایسکلس نے "پارسی" کو اردشیر کے معرکے کے آٹھ برس بعد پیش کیا۔ ایسکلس کے علاوہ ایک اور شاعر فیرنیکوس نے بھی اس معرکے پر طبع آزمائی کی تھی اور "فنیکسہ" یعنی فینیقی دوشیزگان کے عنوان سے ایک تمثیل لکھی جو بدقسمتی سے مفقود ہو گئی۔ بعض کا خیال ہے کہ ایسکلس نے اس تمثیل سے استفادہ کیا یا کم سے کم وہ تمثیل پارسی کی محرک ہوئی۔ ایک اور شاعر نے بھی جس کا نام کوایرلیس تھا اس مضمون پر قلم اٹھایا تھا اور اس کی نظم کا عنوان پرسیکا تھا جس میں دارا اور اردشیر کے معرکوں کو قلمبند کیا گیا تھا۔

اس موقع پر چند معروضات ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ آج جب کہ تمثیل نگاری ایک اعلیٰ فن ہو گئی ہے اور اس فن کی باریکیاں اس درجہ نازک ہو گئی ہیں کہ اچھے اچھے تمثیل نگار، مبصروں کو آج کے معیار سے اوچھے اور مبتدی نظر آنے لگے ہیں، یہ امر قابلِ غور ہے کہ آج کی کسوٹی پر "پارسی"

یا ایسکلس کی دوسری تصانیف کس قسم کا کس دیتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نقد و نظر کا اس پر دارومدار ہے کہ ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے جن کی آب و ہوا میں کوئی تصنیف پیدا ہوئی ورنہ موازنہ یک رخی ہوگا اور اس لیے غیر منصفانہ بھی۔

جو کچھ بیان ہوا اس سے یہ تو ظاہر ہو چکا کہ یونانی ڈراما اپنی ابتدائی شکل میں ہندوستانی نقل اور سانگ سے زیادہ نہیں تھا جو سرِعام ہزارہا آدمیوں کے سامنے ایک ہی وقت میں پیش ہوتا تھا جس طرح کل ہندوستان میں رام لیلا اور راس رلیلا وغیرہ ہوتی ہیں مگر ایسکلس کے زمانے تک اس سانگ اور نقل نے ترقی کر کے جو شکل اختیار کر لی تھی وہ یہ تھی کہ تماشا گاہ ایک نہایت وسیع رام لیلا کے باڑے کی قسم کا مقام ہوتا تھا جس میں ایک وقت میں بیس تیس ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ تماشائی بیٹھ کر تماشا دیکھتے تھے ایک نعل نما نشستگاہ (امفی تھیٹر) ایسی تیار کی جاتی تھی کہ جس میں درجہ بدرجہ نیچے سے اوپر تک زینہ بزینہ بیٹھنے کی جگہیں ہوتی تھیں۔ ان نشستوں کے سامنے سازندوں کا طائفہ ہوتا تھا اور سازندوں کے طائفے کے روبرو اداکاروں کا طائفہ ہوتا تھا۔ اداکار منہ پر بناوٹی چہرے (بیچا کی طرح) لگاتے تھے، اور بجائے اداکارانہ حرکات و سکنات اور چہرے دل کا حال ظاہر کرنے سے بیشتر محض لفظوں سے کام لیتے تھے۔ ابتدا میں منظر اور پردے وغیرہ بھی نہیں ہوتے تھے اور گرد و پیش کے مناظر تک کا معاملہ لفظوں پر آکر ٹھیرتا تھا اور چونکہ اتنے بڑے تماشائیوں کے ازدحام کو محض تقریر یا مکالمے سے قابو میں رکھنا اور ان کی دلچسپی قائم رکھنی ضروری تھی اس لیے گانے بجانے کا حصہ ان نقلوں میں کافی ہوتا تھا اور گانے بجانے کی ضرورت کانوں کو

شاکرانہ نزاکتوں سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ چنانچہ اس تمثیل میں جس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جا بجا طائفہ کے گیت اور بھجن ہیں اور بالخصوص آخر میں اردشیر اور طائفہ مل کر ایک عجیب و غریب قسم کا نوحہ اور ماتم کرتے ہیں ایک یا آدھا فقرہ اردشیر کہتا ہے اور طائفہ اسے پورا کرتا ہے، جو ظاہر ہے کہ محض اوزان و عروض مخصوص نغمے کے اتار چڑھاؤ کی ضرورت کا نتیجہ ہے، ورنہ اس میں اور کوئی خاص بات نہیں۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ مثال کے طور پر آج سے نصف صدی پہلے جب اسیرِ حرص کا تماشا دیکھنے کے شوق میں بقول عوام سقّوں نے اپنی مشکیں بیچ ڈالیں، وہ کیا بات تھی کہ لوگ ایک ایسے گانے پر کہ جس کے الفاظ "مزا دیتے ہیں کیا یار تیرے بال گھونگر والے" ہوں، لٹّو تھے اور اسے کئی کئی بار گواتے تھے اور گلی گلی کوچے کوچے میں "مزا دیتے ہیں کیا یار" کی گونج تھی۔ اسی طرح اپنے زمانے اور اپنے حالات کے اعتبار اور عوام کے خاص مذاق کے لحاظ سے بھی بعض گانے ایسے ہوں گے جو آج ہمیں کتنے ہی پھیکے معلوم ہوں مگر اپنے وقت میں ان کا وہ زور شور رہا ہو کہ جس کا ٹھکانا نہ ہو۔ پھر اس میں گانے والے کے گلے کا بھی حصّہ ہوتا ہوگا اور نہ جانے اور کیا کیا وقتی اور عارضی حالات چیزوں کو چمکا دیتے ہوں گے اور یہی وجہ ہے کہ جن تمثیلوں کو انعام کے قابل نہیں گردانا گیا وہ اور تماثیل کے مقابلے میں خدا جانے کس پہلو پر آکر دب گئی ہوں گی اور آج وہ اپنے کھرے پن کی وجہ سے چمک اٹھیں۔

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا المیہ میں گانا جائز ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ اور موجودہ اقسام و اصناف تمثیل نگاری کے اعتبار سے یہ تمام بحثیں ایک

دوسرے موقع اور محل کا تقاضا کرتی ہیں۔ مگر یہ سراسر غلط ہے کہ محض چونکہ ایک خاص قوم یا خاص ملک یا خاص دور تہذیب نے ایک معیار آج کے حالات اور اپنی ضرورت اور مذاق کے اعتبار سے قائم کر دیا تو وہ معیار مطلق ہو گیا اور مستقل طور پر ہر قوم ہر ملک اور ہر قسم کے حالات کے لحاظ سے حاوی اور مکمل ہو گیا۔ ہر ملک اور ہر قوم اپنی خصوصی طبیعت اور مزاج رکھتے ہیں اور اُن کی تفریح اور ادبی تسکین کے معیار جدا ہو سکتے ہیں۔

بایں ہمہ جو امر خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ آیا باوجود ان تمام اختلافات کے جو خصوصی اور وقتی حالات نے زمانہ قدیم اور زمانہ موجودہ کے معیار نقد و نظر میں کر دیا ہے، آیا تصنیف میں جو حصہ باقی رہتا ہے اس میں کھرا سونا اور مستقل قیمت کا مواد کس قدر ہے اور اس لحاظ سے یونانی تمثیل نگاری آج بھی جس بلند پایے کی ہے وہ قدر و قیمت کے حساب سے بیش بہا ہے۔

افسانے کا مواد اور اس کی حقیقت

یونانی ادبی دور کے باقیات الصالحات باوجود اب بھی وافر ہونے کے اصل سرمایے کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ یونان نے ایک سے بڑھ کر ایک شاعر اور تمثیل نگار، ایک سے اونچا دوسرا ادیب اور صناع پیدا کیا۔ جن میں سے بعض کا ادبی سرمایہ باوجود شہرۂ آفاق ہونے کے چند نظموں سے زیادہ دنیا تک نہیں پہنچا۔ بعض نے وہ شہرت پائی کہ ان کے ناموں سے ناواقف ہونا ادبی دنیا میں ابجد سے لاعلم ہونے کے برابر ہے۔ جس طرح اُردو داں طبقے میں میرؔ و سوداؔ، تلسی داس اور سور داس کے ناموں سے کسی کی ناواقفیت پر اُس کے کندۂ ناتراشیدہ ہونے کا یقین

ہوجائے گا مغربی ادبیات کے دائرے میں مثال کے طور پر شعراء میں پیندار اور سافو کے نام سے ناواقف ہونا وہی اثر پیدا کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح صناعوں میں فیدیاس اور حکمت اور فلسفہ میں سقراط، افلاطون، ارسطو اور فیثاغورث کے نام ہیں۔ نیز تمثیل نگاری میں ایسکلس، سوفوکلیز، اروپدیز، ارسطوفنیس اور منیاندیر کے نام ہیں۔ یعنی یہ فہرستیں نہیں ہیں بلکہ چیدہ چیدہ نام ہیں اور ان ناموں کی پیشانی پر ہیمرس کا نام گرامی ہے جو یونانی مہابھارت اور رامائن یعنی "اودیسی" اور "ایلیاڈ" کا پہلا مصنف گنا جاتا ہے۔ ہیمرس کے بعد ان تصانیف میں اضافہ کرنے والے اور پیدا ہوئے جن میں ہیسید استاذالاساتذہ میں شمار ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت میں ابتدائی اور وسطی زمانے کی تمثیل نگاری میں جو اروپدیز اور ارسطوفنیس پر ختم ہوئی (منیاندیز سے تمثیل نگاری جدید کا آغاز ہوا۔) قریب قریب کلیتہً وہی مواد ملتا ہے جسے ہیمرس اور ہیسید قومی، مذہبی اور اخلاقی اور ادبی روایات اور حکایات کو ضخیم مثنویوں میں چھوڑ گئے تھے۔ ان ہی حکایات پر آنے والے دور میں طبع آزمائیاں اور قلم فرسائیاں ہوئیں۔ مگر گاہے گاہے ہیمرس کی اس تورہ بندی کے ذخیرے کے علاوہ بھی استادوں نے خاص خاص قومی اور معاشرتی زندگی کے مسائل اور معرکوں کو مہم نگارش بنایا۔ چنانچہ اس نئے میدان میں تگ و تاز کرنے کی ایک اور غالباً دوسری مثال استاد ایسکلس کا "پارسی" ہے۔

پارسی کا مواد معرکہ سالامیس سے فراہم کیا گیا ہے۔ پورا واقعہ تو گروٹ کی تاریخ یونان کی پانچویں جلد کے انتالیس، چالیس اور اکتالیسویں بابوں میں مرقوم ہے۔ اور نسبتاً گروٹ کی تحقیقات اور دیانت داری

نے ہردوط، تیوکیدیدیس (تھیوسی ڈِڈیز) قطیشیہ اور دوسرے مورخوں کی غلط بیانیوں اور مبالغوں کا حتی المقدور ازالہ اور تردید اچھے پیرائے میں کردی ہیں۔ ورنہ یونانی مورخوں نے قومی فخاری کے جوش میں بہت کچھ لاف وگزاف اور تعلّی سے کام لیا اور ایرانی غنیم اور ان کی بحری ہزیمت کی خوب خوب خاک اُڑائی ہے۔ گروٹ کی تصنیف کی بارہ جلدیں ہیں اور یوں تو اس دور اور اس واقعہ کا بالتفصیل گبن کی تاریخ "رومہ کا زوال و ادبار" میں موجود ہے۔

مگر ایسکلس چونکہ اس معرکہ میں یونانی فوج کے ساتھ خود موجود تھا، اگر وہ شاعر اور قومی کارناموں کا شد و مد سے مداح اور قومی فخر و غرور کا جامہ پہن کے مبالغہ کا قلم نہ اُٹھاتا اور محض دیانت دار وقائع نگار ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس سے بہتر تاریخی مواد اور کون فراہم کرسکتا تھا۔ مگر ایک ایسا ادبی اُستاد اور نغز گو شاعر کہ جیسے ایسکلس جب ایک ایسے قومی معرکے پر قلم اُٹھائے کہ جس نے دنیا کی تاریخ کا سیلاب اُلٹ کر رکھ دیا تو ظاہر ہے کہ ہم اس سے یہی توقع کرسکتے ہیں کہ وہ غنیم کی انتہائی ستایش اور تعریف بھی کرے گا تو اس نیّت اور اس مقصد سے کہ اسی قدر اپنی فوج کی فتح و نصرت پر مدح سرائی کے پل باندھے اور اس کی فوقیت کو چار چاند لگا دے۔ چنانچہ اس تمثیل میں یہی حال ہے کہ اصل واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے کہ ایرانی کروفر، اور ساز و سامان کو بڑھا بڑھا کر دکھایا ہے تاکہ ہزیمت دینے والوں کا درجہ اور ان کی شجاعت کی دھاک بندھ جائے اور جوانمردی اور جانبازی کے نقشے بھی اسی زورِ قلم سے کھینچے ہیں اور یونانیوں کی برتری اور دلاوری کو بہت بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے یہی کیفیت شوسہ کے ایوان و قصور میں "قومی عزاداری" اور نوحہ و ماتم بے پایاں کی ہے صحیح یا قریب قریب صحیح واقعہ جو گروٹ نے بڑی تفصیل سے

تحریر کیا ہے اقلاً و مختصراً یہ تھا کہ سنہ ۴۹۰ قبل مسیح میں دارائے اعظم کے سپہ سالار اور امیر البحر داتس نے یونانیوں بالخصوص علاقہ اطیقہ کے باشندوں پر فوج کشی کی۔ مگر اس سے پہلے کہ اس فوج یا دارائے اعظم کے جانشین اور فرزند اردشیر کی مہمات کا ذکر آئے یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ جہاں تک چھٹی صدی قبل مسیح کا تعلق ہے تمام آباد، مہذب اور با اقتدار دنیا چار حصوں میں منقسم تھی۔ جس کا متقدمین کو علم تھا۔ اس رُبع مسکوں کا مرکز اور اس دنیا کی قوی ترین اور وسیع ترین قوت اور اقلیم ایرانی کہلاتی تھی۔ یہ مملکت اور شہنشاہیت پانچویں صدی قبل مسیح سے پیشتر مشرق میں خطا و ختن صُغد و باختر لے کر نیچے سندھ تک اور شمال میں باختر سے چل کر بحیرۂ خزر اور علاقہ خوارزمیہ سے گزر کر توران، ماوراُ النہر اور قفقاز سے بڑھ کر بحیرۂ اسود کے سواحل تک تھی اور مغرب میں آبنائے باسفورس سے پار موجودہ یونان کے کل شمالی علاقوں یعنی علاقۂ مقدونیہ و ثراقیہ (تھرس) تک پھیلی ہوئی تھی اور پھر تھسلی وغیرہ اطیقہ کے شمالی علاقوں کو گھیرتی ہوئی اور بحر ایجیان کے جزائر میں تسلط قایم کرتی ہوئی ایشیائے کوچک کو بغل میں دبا کے نیچے موجودہ شام و فلسطین اور فینیقیہ، جزیرۂ قبرص وغیرہ تمام ساحلی علاقوں کو مطیع کر کے مصر قدیم میں جاکر پرچم شاہی لہراتی تھی اور وہاں سے چکر لگا کے (عرب کے اندرونی علاقوں کو چھوڑ کر) بحیرۂ ایران اور بحرین کو سمیٹتی ہوئی سندھ سے جاملتی تھی اور اندرون اقلیم میں تمام قدیم ممالک آجاتے تھے۔ موجودہ ایران ان چوّن[۵۴] علاقوں میں سے جن کا ہردوط، نے اور قطیشیہ نے ذکر کیا ہے۔ محض ایک صوبہ اور ایک علاقہ ہے۔ ایران قدیم سے وسیع تر قلمرو اس وقت روے زمین پر نہ تھی۔ مگر ہندوستان قدیم اور چین جو اس مملکت کے ہمسر اور ہمعصر تھے وسعت میں کم نہ تھے، گو ان

دونوں قدیم اور عظیم الشان ملکوں، بلکہ بجائے خود براعظموں کو قدیم ایران سے ہمسری اور ہم چشمی کا رشتہ تھا مگر مغربی رشتوں کے اعتبار سے مغربی تاریخ میں اس زمانے اور اس دور میں اس سلطنت سے وسیع تر اور قوی تر دوسری کشور نظر نہیں آتی۔ گو اس زمانے سے قریب چھ سات سو برس پہلے مصر قدیم کی اقلیم فرعون آمیفرنس کے دور میں اس سے کچھ زیادہ نہیں تو کم وسیع نہ تھی، قدیم مصر کے ممالک محروسہ بھی ادھر باختر وضعد تک تھے اور ادھر ایران، توران، خیطہ یا خِطا (علاقہ خطّی) اور کل افریقی سمندر (جسے وہ بحر خضر کہتے تھے) تک پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ ربع مسکوں کے اُس وقت تین حصے تو یہ ہو گئے یعنی چین، ہندوستان اور ایران اور چوتھا حصہ وہ تھا جس میں کل باقی معلوم اور نامعلوم دنیا آجاتی تھی جس کا بیشتر حصہ قطعی وحشی اور غیر مہذب گنا جاتا تھا اور یونان کا صرف وہ علاقہ جو فارس کا مطیع نہ تھا یا جس سے ایسے تعلقات تھے جیسے کل تک انگلستان کے ہندوستان کے راجاؤں، نوابوں یا نیپال کے بادشاہ اور افغانستان کے فرمانرواسے ہیں کہ بے کارم و باکارم چوں مد بہ حساب اندر۔

اس جہاں گیر سلطنت کا دار السلطنت سوسہ تھا جس کے آثار آج بھی کوہ بے ستون یا بہ تحقیق بعض بہستون (جو ممکن ہے کہ بہشتوں اور بہشت کا بزرگوار ہو) عراقِ عجم اور ایران کی سرحد پر موجود ہیں۔ اس سے شمال مغرب کی جانب قدیم "ماد" یا میدی مملکت کا دارالحکومت اکتبانہ یا ہمگنانہ تھا جسے بعد ازاں عربوں نے ہمدان کہا اور آج وہ ہمدان ہی کے نام سے آباد ہے۔

دارایوش یا دارائے اعظم نے اس سلطنت کو استحکام دیا تھا۔ گو کیرس یا گورش اس کے مورثِ اعلیٰ نے اسے اسّی برس قبل قائم کیا تھا۔

اس سلطنت کے (بقول ہر دوط چوّن) ممالک مطیع اور باجگزار تھے۔ جن میں کارسلطنت "خَشتر پا" یا نائبین بادشاہ کے سپرد تھا جنھیں زند نے "شوتُرپیتی" لکھا ہے اور جو سنسکرت کے چھتر پیتی اور کشتیر پتی کا ہم معنی ہے) یہ خشتر پا یا نائب بادشاہ عموماً شاہی خاندان یا امرائے کبار میں سے منتخب ہوتے تھے۔ یہ نائبین سلطنت آٹھ ہوتے تھے کیونکہ ایک ایک نائب کے ماتحت کئی کئی بڑے بڑے ملک ہوتے تھے اور ممالک محروسہ و مفتوحہ کے بادشاہ امیر کبیر جن میں بعض بعض موقعوں پر شہرہ آفاق شہزادیاں بھی ہوتی تھیں۔ دنیا بھر کے عالم فاضل، سفیر، حاکم، نجومی، اہل فن، ارباب کمال و ادب سب سوسہ کے دربار میں حاضریاں بجاتے اور شاہی ایوان و محلات اور محکموں کی نگرانی اور کارفرمائی پر مامور کیے جاتے تھے یا شہنشاہ کی ندیمی اور مصاحبت کی عزت سے سرفراز ہوتے تھے اور شہنشاہ کے دبدبے اور رعب کا ڈنکا اور احکام کا نقارہ چاردانگ عالم میں صبح و شام بجتا تھا۔ گویا یہ سلطنت اس زمانے کے روے زمین پر اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک بسیط تھی اور ایرانی تسلط عالمگیر تھا۔

ان ضمنی تفصیلات کی اس وجہ سے ضرورت پیش آئی کہ وہ نقشہ جو اس تمثیل میں دکھایا گیا ہے اس کا صحیح اندازہ سامنے آجائے نیز خشتیر پا کا ذکر اس لیے ضروری ہوا کہ کم سے کم دو خشتیر پا اور وزرائے سلطنت ایسے ہیں کہ جن کا تذکرہ ماراتھون اور سالامیس کے معرکوں کے سلسلے میں آتا ہے۔ ایک مردان (بہ تلفظ ایرانی مردون) اور دوسرا اروفیرین۔ آخرالذکر دارائے اعظم کا بھائی تھا جو مغربی ممالک کا خشتیر پا یا نائب السلطنت تھا۔ اردفیرین ایشیائے کوچک اور بحیرہ ایجیان کے جزائر کے تمام علاقہ پر حکمراں تھا۔

یہاں اس قدر تذکرہ کر دینا اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یوں تو خطۂ یونان خدا جانے کب اور کس قوم نے بسایا مگر اس علاقے میں جس کو اب یونان کہتے ہیں اور جو آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے متعدد جداگانہ ریاستوں میں تقسیم تھا جن میں سے بعض مثلاً تھراقیہ، مقدونیہ، بیوشیہ کے علاقے جو براہ راست ایران کے باجگزار تھے اور بعض مثلاً غوث وغیرہ جس میں قدیم مائیسینی حکومت خود مختار تھی جہاں یونان سے بھی پرانی تہذیب چلی آتی تھی وہ فارس کے رفقا میں شمار ہوتے تھے جو حقیقت میں ایک قسم کی ماتحتی تھی مگر اطیقہ اور سپارٹہ ایک دوسرے کے رقیب مگر فارس سے آزاد تھے اور کچھ یونان کے مشرقی ساحل کے جزیرے ان کے حلیف تھے اور خاص خاص موقعوں پر یہ مل جایا کرتے تھے۔ مگر شہنشاہِ ایران کے اقبال کا ستارہ اس درجہ اوج پر تھا کہ یہ تمام علاقے بھی ایرانیوں کا لوہا مانتے تھے اور ان سے دب کر رہتے تھے۔ آزاد یونان کا علاقہ جس کی ترقی نے دنیا کی تاریخ کا قریب قریب نصف حصہ ان معنوں میں سنبھال لیا کہ کل مغرب (موجودہ مغرب) اس کا مقروض اور مرہون ہے بمشکل ہندوستان کے ایک معقول ضلع کے برابر تھا۔ کل کائنات یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ ستر میل طول میں اور کوئی بائیس تیئس میل عرض کا رقبہ جس کی چند لاکھ کی آبادی تھی۔ دنیا میں قلیل التعداد قوموں نے جو کارنامے بیش کیے ہیں وہ ان کروڑوں کی آبادی سے کہیں زیادہ ہیں جو اپنی تعداد پر ناز کرتے رہ جاتے ہیں۔ چھوٹی تعداد کا نظم جلدی اور اچھا ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ بیرونی حملوں سے مغلوب نہ ہو جائے۔ ایجیان کے تمام جزیرے اسی نسل اور خاندان کے لوگوں نے وقتاً فوقتاً آباد کیے تھے۔ مگر ایشیائی ساحل کے قرب و جوار کے جزائر میں فنیقیوں اور یونانیوں اور کہیں کہیں قدیم مصریوں کی

بھی آبادیاں تھیں۔ اندرون ملک یعنی ایشیائے کوچک (موجودہ اناطولیہ) میں کئی قدیم یونانی آبادیاں اور حکومتیں تھیں جن میں سے لِدیہ جس کا ساردیس دارالحکومت تھا خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اور جنوبی حصّے میں فنیقی اور سامیری (سمیری نہیں جو دجلہ اور فرات کے دوآبے میں بستے تھے) وغیرہ ایشیائی قومیں بستی تھیں۔

یونان قدیم کا باوا آدم نرالا تھا اُسے اُگائیجیس یا اُجائیجیس کے نام سے بھی یاد کرتے تھے اور ہر پرانی ودتیا نوسی یا "پراجین" اگرچہ قصے اور کہانیاں تو اور بہت ہیں، اور ہر علاقے کا باوا آدم الگ ہے۔ مگر ایک قصہ یہ بھی ہے اور دلچسپ ہے کہ کہیں خداوند عالم (یونان) یوف اتفاق سے ایک فانی الاصل دوشیزہ اِی اُو یا آئیو پر فریفتہ ہو گئے وہ بیچاری ان کی زوجہ محترمہ ہیرا کی کنیز تھی۔ اس راز کے افشا ہوتے ہی محل یوف میں آفت برپا ہوگئی اور مخدومہ و معظمہ محل کلاں نے غریب آئیو کو گائے بنا کر کہیں قفقاز وغیرہ کے مرغزاروں میں چھڑوا دیا۔ مگر بھلا نگاہِ خداوندی سے یہ معاملہ کیا پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ اس پر بھی جب محل کلاں کو صبر نہ آیا تو انھوں نے ایک ڈانس (بعوضۂ اکبر۔ بہت بڑا مچھر) بھیج دیا کہ وہ اس مظلوم آئیو کو ایک جگہ نہ ٹھیرنے دے اور بھگائے بھگائے پھرے۔ خیر وہ معصوم اور مقہور کہیں مقدونیہ کے میدانوں میں پہنچی اور وہاں سے نہ جانے کس طرح اس نے آبنائے باسفورس عبور کی اور ایشیا میں پہنچی۔ چنانچہ باسفورس دراصل یونانی لفظ "بو" اور "سپورس" سے مرکب ہے۔ بو بمعنی گاؤ اور سپورس بمعنی عبور کرنے کا مقام "معبر" یعنی "معبر گاؤ"۔ پھر وہ ایشیا کے کونے کونے میں جھک مارتی پھری اور بالآخر وادی نیل میں پہنچی۔

یہاں خداوند یوف (مصر میں ثور اور بقر دونوں کی پرستش ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ اس قصے میں کچھ اس طرف کا بھی اشارہ ہے اگرچہ خود مصری قصہ اس سے کہیں زیادہ دلکش اور روحانی اور ادبی خوبیوں سے لبریز ہے۔) آخر اس سے آملے اور نتیجۂ وصل یہ ہوا کہ ایک صاحبزادہ تولد ہوا جس کے کفو دو بیٹے ہوئے ایک ایجتپوس (انگریزی میں ایجپٹس) اور دوسرا وناؤس۔ دناؤس نے ارغوس اور یونان بسایا اور ایجتپوس نے وادی نیل۔ خیر اس قصہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ خداوند یوف کو جب دنیا میں کھیتی اور تہذیب وتمدن پیش نظر ہوا تو گائے پیدا ہوئی اور ایشیا کے کونے کونے میں گئی۔ مگر خداوند یوف کے مقبول بلکہ خود ان کی اولاد درحقیقت وادی نیل میں پیدا ہوئی (یعنی یونانی خیال سے پیدائش آدم) اور اسی اولاد کا ایک خاندان مصر اور دوسرا یونان میں بسا۔ اتفاق سے مصر قدیم میں۔ آتم (شاید آدم) خدائے مطلق کو کہتے تھے۔ نہ معلوم اس کا آتما یا پرماتما سے کچھ تعلق ہے یا نہیں۔ یہ قصہ بھی دلاویز ہے یعنی ابتدائے آفرینش سے پہلے آتم (آتُم) یا خدائے را یا رع یا رح یعنی (خورشید) نے اپنے تن خاص اور کفو اصل سے دو بچے پیدا کیے یعنی شُو (صبا، باد، ہوا) طیفینط یا تیف نیت (خلائے محض) ان دو اولادوں نے جیب یا سیب (ارض) اور نُوط یا نوت (آسمان) پیدا کیے۔ اور ان دونوں نے اوسائرس یا اوسیریس (دریائے نیل) آئسس یا آئی سیس (زرخیز وادیِ نیل) سیط یا سیت (دشت) اور نیفطیس (موت کی دیوی) پیدا کیے۔ اہرام مصری کے کتبوں میں یہ تفصیلات موجود ہیں مگر یہاں آتم سورج اور اس کی کرنوں کی شکل میں نہیں ہے۔ بلکہ صبح کے وقت ایک نیلوفر کی کلی میں بچے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ دوپہر کو اس کا شباب ہوتا ہے اور غروب کے

وقت وہ ایک عصا لیے ہوئے پیر ناتواں نظر آتا ہے۔

پھر سیط (یا غالباً شیطان) آتم را کے خلاف بغاوت کرتا ہے جو وہی عزازیل اور خالق مطلق کا قصہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہاں ابھی "ثور" اور "بقر" نہیں ہیں مگر آگے چل کے ان کا بہت بڑا دورا ہا ہے۔ ایک اور مصری داستان آفرینش کائنات اس سے زیادہ خوبصورت ہے یعنی ابتدائے آفرینش میں سیب (ارض) مرد اور (آسمان) ایک دوسرے کے عاشق نُو (عدم) میں محو وصل تھے کہ خدائے شو (باد) آب بحر ازل سے پیدا ہوا اور اس نے دونوں کو الگ کر دیا معشوقہ آسمان کو اٹھایا تو وہ اس طرح اٹھی کہ دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں زمین پر قائم کر دیئے (تا کہ عاشق کو دیکھتی رہے) اور وہ آسمان کے چار ستون افق پر بن گئے۔ یہاں سے چل کر بابل میں اس قصہ نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ جو منجھ کے یہودیوں کی مذہبی روایت کتاب پیدائش میں داخل ہو گیا۔ خیر یہ معاملہ بہت دور دراز چلا گیا اور محض دلچسپی کی خاطر قلبند ہو گیا۔

آئیو کی اولاد آئیونین یا یونانی ہوئے۔ مگر جس زمانے کا یہ قصہ ہے یونان میں آئیونیہ اس حصّے کو کہتے تھے جو مشرقی علاقے میں مملکت فارس کا مطیع تھا اور ہزار سال پیشتر سے یونان اور اس علاقے میں بڑی رقابت ہو گئی تھی۔ چنانچہ یونانیوں کا ادبی سرمایہ الیادا اور اودیسی اس ایک جنگِ عظیم کا افسانہ ہے جو یونانیوں اور شہر طروئے کے فرماں روا کے مابین ہوئی تھی طروئے باسفورس کے مشرقی ساحل پر ایشیائے کوچک کے شمال مغربی حصّے میں اس مقام پر تھا جہاں ایک چھوٹا سا جزیرہ نما بن گیا ہے۔ اس طروجانی معرکے کا معاملہ اور پوری داستان یونانی مہابھارت ہے جو غیر معمولی اور انتہائی

اختصار سے اس طرح ہے کہ شہر طروئے کے با اقتدار شہر یار پریام کا ایک فرزند پاریس دوران سیاحت میں یونانی (سپارطوی) حکمران مینیلاؤس کے علاقے میں پہنچا اور اس کا مینیلاؤس کی حسین بیوی ہیلین سے معاشقہ ہوا اور وہ ہیلین کو ورغلا کے طروئے لے آیا۔ مینیلاؤس کا ایک بھائی اگامیمنون ارغوس کا شہر یار تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی امداد کا معاہدہ کیا تھا اور ان کے علاوہ اور یونانی ریاستیں بھی حلیف تھیں سب نے مل کر طروئے پر چڑھائی کر دی۔ اور آٹھ یا دس برس کے محاصرے کے بعد جس میں بڑا کشت و خون ہوا، اور طرح طرح کی شجاعت و جوانمردی کے کارنامے ظہور میں آئے۔ بالآخر یونانیوں نے یہ داؤں کیا کہ ایک مصنوعی گھوڑا جس میں اسلحہ بند حملہ آور بٹھا دیئے تھے طروئے میں کسی طرح داخل کر دیا اور اس میں سے یونانی دلاوروں نے نکل کر شہر پناہ کے دروازے کھول دیئے اور پھر کیا تھا کشتوں کے پشتے لگ گئے اور مشہور آفاق شہر طروئے کو جلا ڈالا۔

مگر اس داستان کو مہابھارت اور داستان امیر حمزہ کی طرح کئی جلدوں میں بیان کیا گیا ہے اور معرکہ طروجانی یونان اور اب یورپ بھر کی مغربی قوم کا سب سے بڑا معرکہ ہو گیا ہے۔ جنگ مشرقی اور مغربی یونانیوں میں ہوئی تھی مگر قصہ بڑا طولانی بن گیا جس کا طول گیسوئے یار سے کم نہیں۔

اور لطف یہ ہے کہ حقیقت میں اصل قصہ شروع ہوا ایوان خدا گاہی میں۔ اتفاق سے تین خدازادیاں کہیں ایک جگہ جمع ہو گئیں اور ان تینوں کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا اور سابقت کا معاملہ طے نہیں ہوتا تھا تو انھوں بدبخت فانی الاصل پاریس سے کہا کہ وہ بتائے کہ ان میں سب سے زیادہ حسین کون ہے۔ اس کی جو شامت اعمال نے دھکا دیا تو اس نے حسن کی

دیوی قبرص یا زہرہ کو حسین ترین بتا دیا۔ بس پھر کیا تھا آفت برپا ہو گئی اور ایوان خدائی میں اس جنگ کے برپا کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ خداوند یوف تو کائنات کے اور معاملات میں آئین بندی کے قصوں میں پھنس گئے اور ان خدا زادیوں اور خدا زادوں نے معرکہ کارزار گرم کر کے بڑے بڑے تماشے دیکھے۔

ان جملہ ہائے معترضہ کے بعد اصل مضمون کی طرف عود کرنا ضروری ہے اگرچہ یہ ایشیائے کوچک اور آئیونی جزائر کے یونانی مغلوب و محکوم بنائے جا چکے تھے اور وہ ایرانی رعایا تھے مگر وقتاً فوقتاً ان کو خود بھی اپنی آزادی کی خواہش ہوتی ہو گی اور وہ ہمت والے بھی پیدا ہوتے رہتے تھے جو انھیں طوقِ غلامی اتارنے پر آمادہ کرتے تھے۔ چنانچہ دارائے اعظم کے دوران حکومت میں جزائر اور (یورپی) اور دیگر علاقوں میں سرکشی اور بغاوت کا بازار گرم ہوا، سپہدار نائب السلطنت اردفیرین نے فوراً تدارک شروع کیا اور ساحلی جزائر کو مغلوب اور حلقہ بگوش کر کے ابنائے ہیلیہ (درہ دانیال) عبور کر کے مغربی ممالک محروسہ پر فوج کشی کی مگر بدقسمتی سے بحیرۂ ایجیان کے ان پر آشوب اور طغیانی بدوش حصوں میں جو جہاز رانی کے لیے ہمیشہ خطرناک رہے ہیں ایرانی بحری بیڑہ قریب قریب تباہ ہو گیا اور اسے مجبوراً اطیقہ اور ان علاقوں کو چھوڑ کر واپس آجانا پڑا جن کی سرزنش مقصود تھی۔ دارائے اعظم کو یہ پسپائی ناگوار گزری اور اس نے خود اس مہم کو سر کرنے کا فیصلہ کیا۔

شاید یہاں کچھ اور تفصیل بیان کر دینی دلچسپی کا باعث ہو۔ دربار سوسہ و اکبتانہ میں علاوہ مشرقی و مغربی سلاطین اور امرائے باجگزار اور ان کے متعلقین کے حکما، اطبا، منجم اور مشاہیر بھی رہتے تھے۔ خصوصاً جن فرمانرواؤں

کو مغلوب کیا جاتا تھا اگر وہ اطاعت قبول کر لیتے تو انھیں عموماً دربار شاہی میں مصاحبت اور ندیمی کی عزّت حاصل ہوتی تھی اور وہ اس طلائی طوق غلامی سے سرفراز ہو کر دائمی جلا وطنی میں تکلیف دہ عیش و آرام اور محکومی کے اعزاز سے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض تو اس حکمت عملی اور رموز و مصلحت خسروی کے شکار ہو جاتے تھے اور شہنشاہ کی مصاحبت کو مغتنم سمجھنے لگتے تھے اور بعض حب وطن اور آزادی کا شعلہ دل میں لیے موقع کا انتظار کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کے روس (سائرس) اعظم کے مصاحبوں میں کری سوس (جسے بعض نے قارون کہا اور سمجھا ہے) والیٔ لدیہ تھا کہ جس کا گنج بے پایاں شہرۂ آفاق تھا اور جس کی فرزانگی کا خود کے روس اعظم قائل تھا۔ اس کا قصہ بجائے خود دلچسپ ہے۔ شکست کے بعد کری سوس جب قید ہو کر کے روس کے حضور پیش ہوا تو آخرالذکر نے پوچھا کہ اب کس سلوک کی توقع کرتے ہو۔ کری سوس نے خودداری سے کام لیا اور جواب معقول دیا۔ مگر کے روس نے آزمانے کے لیے ایک چتا تیار کرا رکھی تھی اور حکم دیا کہ کری سوس کو چتا پر بٹھا کر جلا دیا جائے جوں ہی چتا کو آگ دی گئی (خوش عقیدت یونانی مورخوں کا قول ہے) ابر آیا بجلی کڑکی اور بارش ہوئی اور آگ بجھ گئی۔ اس قصے کو گبن نے تفصیل سے اور گروٹ نے بھی خلاف قیاس قرار دیا ہے۔ گو ہردوط نے اس میں بہت کچھ رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ کری سوس یا قارون تازیست دربار کے روس میں ایک معزز باوقار مصاحب کی حیثیت سے رہا اور کے روس کا دانشمند مشیر کار اور رفیق ثابت ہوا۔ کے روس کے جانشینوں نے بھی اسی مصلحت اندیشی اور حکمت عملی سے کام لیا۔ چنانچہ دارائے اعظم اور اس کے وارث تخت و تاج اردشیر

کے دربار میں بھی ایران توران، باختر، صفد، ہند، مصر اور یونان کے امرا، اور حکما، رہتے تھے۔ دارا کے دربار میں ایک حکیم دیموقیدیس بھی تھا جو ابتدا میں قیدی بنا کر لایا گیا تھا مگر ایک موقع پر جب دارا کے سخت موچ آئی اور ہفتہ بھر تک ایرانی اور مصری اطبا سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ دارا کو نیند آجائے تو کسی کے ذکر کرنے پر یہ قیدی جو جراح کامل تھا بلایا گیا۔ ابتدا میں اس نے جراح اور طبیب ہونے سے ڈر کے مارے انکار کیا مگر بالآخر جب سزائے سخت کا ڈراوا دیا گیا تو اس نے اقرار کیا اور دارا کا بڑی کامیابی سے علاج کیا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اسے معاودت وطن کی اجازت ہو جائے مگر بھلا شاہوں کے دربار سے کارآمد آدمیوں کو کب اجازت مل سکتی ہے۔ اتفاق سے دارا کی ملکۂ کلاں (کلاں تو خیر نہ تھی کیونکہ بادشاہ ہونے سے پہلے اس کی بیوی تھی اور اس سے لڑکا بھی تھا۔ مگر اسے ملکۂ کلاں ہونے کی عزت حاصل نہیں ہوئی نہ اس کے بیٹے کو تخت نصیب ہوا) کی چھاتی پک گئی اور سخت تکلیف تھی کہ دیموقیدیس کو معالجہ کا حکم ہوا طبیب یونانی نے بڑی خوش اسلوبی سے علاج کیا اور ملکہ کو شفائے کامل ہو گئی دیموقیدیس نے موقع غنیمت شمار کیا اور ملکہ سے یہ صلہ مانگا کہ اسے وطن واپس جانے کی اجازت دلوا دے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا کہ یوں اجازت نہیں ہوگی بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ دارا کو اس پر رضامند کیا جائے کہ وہ یونان کو تسخیر کرے اور ابتدائی تجسس کے لیے ایک وفد بھیجے جس کی سرکردگی دیموقیدیس کے سپرد ہو۔ ملکہ نے وعدہ کر لیا اور مناسب موقع دیکھ کر بادشاہ کو رضامند کر لیا۔ چنانچہ بقول ہیرودوط ملکہ نے راز و نیاز کے دوران میں بادشاہ سے کہا کہ میری خواصوں اور کنیزوں میں یونان کی حسین عورتیں نہیں۔ دیموقیدیس کا

بیان ہے کہ سرزمین یونان مالا مال اور بے حد سرسبز و شاداب ہے اور وہاں کی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔ آپ اس ملک کو فتح کیوں نہ کریں۔ اور اس واقعہ پر اس نے یونان پر فوج کشی کی بنیاد رکھی ہے۔ اگرچہ اس واقعہ کے بیس پچیس برس بعد یونان کی تسخیر کا اہتمام کیا گیا کیونکہ اس وقت دارا کو سدیہ کی مہم در پیش تھی۔ سدیہ شمال کا وہ تمام ملک ہے جو آج روس کا جنوبی علاقہ ہے۔ مغربی سدیہ میں وہ تمام علاقہ تھا جو دریائے (اشتریا) ڈینوب کے شمال اور بحر اسود کے شمال میں تھا یعنی بیس عربیہ، مالدیویہ بلکہ بلغاریہ، رومانیہ اور تمام ادکرانیہ کا علاقہ۔ اور دارا کا خیال تھا کہ اس علاقے کو فتح کر کے قفقاز اور خوارزم سے ایران واپس آجائے گا۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مہم کے دوران میں آج سے پورے ڈھائی ہزار برس پہلے دارا کو بالکل وہی آفت بھگتنی پڑی تھی جو نپولین کو روس کے حملے کے دوران میں یا ہٹلر کو سٹالن گراد کے حملے کے دوران میں پیش آئی۔ اس وقت بھی لاکھوں سپاہ دریائے اشتریا پار کر کے گئی اور موجودہ دریائے والگا تک دارا نے تگ و تاز کی مگر سدیوں نے یعنی روسیوں نے اس وقت بھی سب سامان، کوئیں، کشت زار غارت کر دیئے اور خود خانہ بدوش تو تھے ہی، پیچھے ہٹتے چلے گئے اور بالآخر دارا کو بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ آگیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سدیوں کے بادشاہ یا سرگروہ نے دارا کو پسپائی سے پہلے ایک چوہا، ایک پرندہ، ایک مینڈک اور پانچ تیر بھیجے تھے جس کا یہ مطلب تھا کہ یا تو چوہے کی طرح تہ زمین میں غائب ہو جاؤ یا پرندے کی طرح اُڑ جاؤ یا مینڈک کی طرح پانی میں غوطہ لگا جاؤ، ورنہ تیر تمہارا اور تمہاری فوج کا قلع قمع کر دیں گے۔ خیر اس جملۂ معترضہ کے بعد

یہ واقعہ صحیح ہے کہ دارا نے ایک متجسسانہ وفد دیموقیدیس کی سرکردگی میں روانہ کی اور عرصہ تک اس غرض سے یونان کے جزائر وغیرہ کا خوب جائزہ لیا گیا۔ مگر واپسی کے دوران میں دیموقیدیس نے فریب کیا اور نکل بھاگا اور بلکہ اپنے جزیرہ کے ہموطنوں سے وفد کا سارا ساز وسامان لٹوا دیا اور وفد کے لوگ بہزار خرابی واپس پہنچے۔ ان حالات کو ہیرودوط اور دوسرے یونانی مورخوں نے تفصیل سے لکھا ہے اور گروٹ نے ان واقعات کو سلجھا کر صحیح روایات کو قلمبند کیا ہے۔ قدرتی بات تھی کہ اس واقعہ کے بعد دارا غضبناک ہو۔ مگر وہ حملہ جو ۴۹ ق م میں ہوا۔ اس کی وجوہ دوسری تھیں۔ اگرچہ متذکرہ بالا واقعہ نے شہنشاہ کو فتح یونان کی طرف متوجہ ضرور کر دیا ہوگا۔ دربار میں یونان کے کئی فرمانروا جو اپنی مطلق العنانی یا دستِ تظلم دراز کرنے کی وجہ سے اپنے اپنے ملکوں سے جلا وطن کر دیئے گئے تھے، مقیم تھے۔ یعنی سپارطہ اور اثینیہ کے حکمران بھی سوسہ میں پناہ گزیں تھے اور مغلوب جزائر کے حکمراں بھی۔ ان میں سے ایک ہستیاس نامی بھی تھا اور اس میں کلام نہیں کہ اس کا سواحل ایشیائے کوچک اور ساحلی جزیروں میں اقتدار اور رسوخ تھا۔ مگر دارا نے اسی وجہ سے اسے اپنے دربار میں بطور ندیم و مصاحب نظر بند کر رکھا تھا۔ شاید نظر بند کسی قدر شدید لفظ ہے، حضوری کا پابند کر رکھا تھا کہنا مناسب ہوگا۔ وہ درپردہ اس کوشش میں تھا کہ علاقہ مذکورہ میں سرکشی ہو تو اُسے شاید اس سرکشی کے فرو کرنے کے لیے موقع مل جائے اور اس طرح وہ قید و بند مصاحبت سے آزاد ہو جائے۔ اتفاق سے اس کے داماد نے از خود بغاوت کا ڈول ڈال دیا تھا۔

ہتیاس نے اس کو اس جدت سے پیام بھیجا کہ ایک غلام وفادار کا سر منڈوا کر اس کی کوری چندیا پہ پیام داغ دیا اور جب بال بڑھ گئے اور داغے ہوئے نشان ڈھک گئے تو اسے سوسہ سے روانہ کر دیا (اسی طرح خلیفہ نصیرلدین اللہ نے بغداد سے قراقورم کے دربار میں خوارزمی حکومت کے خلاف امداد طلب کرنے کو ایک وفادار غلام بھیجا تھا جس کے سر کے بال منڈوا کر اس کی کوری چندیا پہ سوئیوں سے چھید کر تیل بھر دیا تھا اور بال بڑھ جانے پر اسے خان کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا) چنانچہ ایستاغورث نے یہ پیام پہنچتے ہی مشیروں اور ہم خیال یونانیوں کو جمع کیا۔ اور بغاوت کا شعلہ بھڑک اٹھا ادھر ہتیاس نے بادشاہ سے عرض کی کہ میں تو پہلے ہی عرض کرتا تھا۔ میری غیر حاضری نے یہ سب طوفان برپا کیا۔ اب بھی اگر پروانگی ملے تو خود جا کر اس مفسدہ کو بھی فرو کر دوں گا اور باقی تمام یونان کو بھی حضور کی حلقہ بگوشی میں لے آؤں گا۔ چنانچہ اسے اجازت مل گئی اور وہ روانہ ہو کر صاردیس پہنچا اور اردفیریں نائب السلطنۃ اور بادشاہ کے بھائی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اردفیریں چونکہ باغیوں اور سرکشوں کے قریب تھا اسے صحیح حالات معلوم تھے، چنانچہ اس نے باوجود ہر طرح دانا اور دانشمند ہونے کے یہ غلطی کی کہ غصے سے ہتیاس کو مخاطب کر کے کہا "ہتیاس واقعہ صحیح میں تمھیں بتاؤں یہ کفش دوزی تمھارا کام تھا اور تمھارے داماد ایستاغورث نے تو صرف یہ پاپوش پہن لی ہے" نہ معلوم اور کیا کیا لطیفہ سنجیاں اور کیا کیا گفتگوئیں ہوئی ہوں گی۔ ہتیاس معاملہ کو تاڑ کے راتوں رات فرار ہو گیا اور اتفاق یہ ہے کہ جب وہ وطن پہنچا تو لوگوں نے اسے غدار اور

دارا کا فرستادہ سمجھ کر قید کر لیا۔ مگر بالآخر اس نے اطمینان دلایا کہ یہ سب بغاوت خود میری ساختہ پرداختہ ہے۔ غرضیکہ ادھر ہتیاس نے دو طرفہ فریب اور غداری کا بازار گرم کیا اور اُدھر اردفیرین نے تدارک کا اہتمام شروع کیا۔ اس قصے میں ایک اور طرفہ ہوا کہ ہتیاس نے چند خطوط دربار اردفیرین کے عمائدین کے نام اس طور سے لکھ کے روانہ کیے کہ گویا وہ بھی شریک سازش ہیں۔ پیامبر نے سیدھا ان خطوں کو اردفیرین کے ہاتھ میں پہنچا دیا۔ مگر اردفیرین نے حکم دیا کہ یہ خط مکتوب الیہم تک پہنچا دیئے جائیں۔ مگر ان کا جواب ہمارے پاس پہنچایا جائے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ کئی ایرانی عمائدین کو جلاد کے حوالے کیا گیا۔

اس کے بعد اردفیرین نے بغاوت فرو کرنی شروع کی اور یکے بعد دیگرے تمام باغی جزائر کو مغلوب و محکوم کر کے یورپ کا علاقہ زیر نگیں کرنا شروع کیا اور قریب قریب تمام روگرداں علاقہ ازسرِ نو مطیع اور فرمانبردار ہو گیا۔

اس مہم کا اہم ترین واقعہ ہتیاس کے وطن مائیلتس کی فتح تھی جہاں سب سے زیادہ مقابلہ اور میدان کارزار گرم ہوا تھا۔ اس شکست مائیلتس پر یونان کے مشہور شاعر اور ایسکلس کے ہمعصر فرنیکوس نے ایک المیہ تمثیل سپرد قلم کی اور وہ اتنی مؤثر تھی کہ جب اسے تماشاگاہ میں اداکاروں نے پیش کیا تو تماشائیوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور ہچکیاں بندھ گئیں اور اس کا فرنیکوس کو یہ صلا ملا کہ اس پر ایک ہزار درہم (یونانی درخمہ یا درہم) جرمانہ کیا گیا کہ اس نے لوگوں کو ان کے مصائب و آلام یاد دلا کر ان کے دلوں کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ تمثیل بھی گردش مہر سپہری میں دفن ہو گئی

ورنہ آج وہ ادب کا قابلِ قدر نمونہ ہوتی۔ ایسکلس کے پارسی میں جو مبالغہ آمیزی کی رنگینیاں ہیں ان کا ظاہر ہے کہ ایک سبب یہ بھی ہوگا کہ اس کو فرنیکوس کے مائیلیتسی مرثیہ اور المیہ تمثیل کا حشر بھی یاد ہوگا۔

لیدا کی شکست کی تاریخ محفوظ نہیں رہی اور کیونکر رہتی کہ جب اس میں یونانیوں کو ایسی شکست فاش ہوئی اور اس درجہ مصائب اٹھانے پڑے تھے۔ مگر گرورٹ کا اندازہ ہے کہ ۴۹۴ء یا ۴۹۵ء قبل مسیح کا واقعہ ہوگا۔

دارا کو شاید پیچ ہوگئی ہوگی کہ اثینیہ اور سپارطہ کے ورغلانے والے اور بار بار سرتابی اور سرکشی پر آمادہ ہونے والوں کا ساتھ دینے والوں کو قرار واقعی سرزنش ہونی چاہیے۔ مگر بظاہر معاملہ اتنا ہی تھا کہ سرکوبی کا انتظام ہوجائے۔ اور خود دربار میں اثینیہ اور سپارطہ کے وہ جلاوطن کیے ہوئے حکمراں موجود تھے جو اُس آتش خشم پر تیل چھڑکتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ خود اُس دن کا انتظار کر رہے تھے کب اطیقہ اور سپارطہ فتح ہوں اور کب وہ شہنشاہ کی مدد سے پھر اپنے ہموطنوں پر حکمرانی کریں اور سوسہ کے مغربی خشترپا یا نائب السلطنت مقرر ہوں۔ چنانچہ وہ برابر ترغیب دیتے رہتے تھے اور کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ اور بلکہ انھوں نے یہ رنگ جما رکھا تھا کہ حضور ایک بار یہ کانٹا نکل جائے تو تمام یورپ قدموں میں دکھائی دے گا۔ خیر ساحل یونانی کے جزائر کی بغاوت فرو تو ہوگئی مگر دارا کو اطمینان نہیں ہوا۔ چنانچہ اپنے سپہ سالار داتس کو حکم دیا کہ مہم یونان کی تیاری کی جائے اور اثینیہ کے خارج الوطن حکمراں ہپیاس کو ہمراہ لے کر اثینیہ فتح کر کے اُسے وہاں برقرار کیا جائے۔

سنہ ۴۹۰ ق م میں یہ مہم شروع ہوئی اور داتس نے پہلے ان جزائر کو زیرنگیں کیا جو ابھی تک آزاد تھے اور بالآخر اس خطۂ زمین پر جسے تاریخ میں مغرب والے غیر فانی باراتون (ماراتھون) کہتے ہیں۔ ایرانی لشکر جاکر اترا۔

چونکہ ہمیں ابھی اردشیر کے معرکۂ سالامیس کا ذکر قدرے تفصیل سے کرنا ہے۔ ہم یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ماراتون میں رن پڑا اور بظاہر ایرانی افواج پسپائی پر مجبور ہوئیں۔ خود یونانی مورخوں کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں دو سو سے کم یونانی کام آئے اور چھ ہزار سے زیادہ ایرانی کھیت رہے۔ اس نقصان سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ معرکہ کیا ہوگا۔ یونانیوں نے اسے اس قدر بڑھا چڑھا کے لکھا ہے کہ یہ جنگ عظیم سے کم نہیں۔ اور ایرانی لشکر کی بحری اور بری تعداد جو بیان کی ہے وہ اتنی بڑی ہے کہ محض تعداد ہی سے قصہ پاک تھا۔ کیونکہ خود یونانیوں کی تعداد میدان میں دس بارہ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ جس میں سے کل ایک سو بانوے کام آئے۔ تو کیا تو لڑائی ہوئی اور کیا میدانِ کارزار گرم ہوا۔ مگر ہر دوط نے صفحے کے صفحے کالے کیے ہیں اور بلا مبالغہ سیکڑوں کتابیں معرکہ ماراتون پر لکھی گئی ہیں۔ اور اب تک حوالۂ قلم کی جاتی ہیں۔

مگر یہ صحیح ہے کہ داتس کی پسپائی سے خواہ وہ بحری آفتوں کی وجہ سے ہوئی ہو یا اور جو کچھ اس کے اندرونی وجوہ ہوں جو ہمیشہ کے لیے پردۂ عدم میں پنہاں ہو گئیں۔ مغرب اور مشرق کے معاملات پر ایک ایسا مستقل اثر پڑا کہ اس کا خمیازہ ڈھائی ہزار برس تک بھگتنا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد دارا نے معرکۂ یونان کے لیے بڑے پیمانے پر تیاری

کرنے کا حکم صادر کر دیا اور خود فوج کشی کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ایشیا کے کونے کونے میں جنگِ یونان نہیں، جنگ یورپ کا سامان مہیا کیا جانے لگا اور یہ تیاری باختر سے مصر تک اور ہند سے ایشیائے کوچک تک شروع ہو گئی۔ مگر قضا نے بار نہ دیا اور دارائے اعظم جہان فانی سے چھتیس برس حکمرانی کرنے کے بعد عالم جاودانی کو راحل ہوا۔

دارا نے اپنی زندگی ہی میں اردشیر کو وارثِ تخت و تاج مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ اردباز بڑا تھا۔ مگر اردباز پہلی بیوی سے تھا اور اس وقت پیدا ہوا تھا کہ ابھی دارا تخت نشین نہیں ہوا تھا۔ مزید برآں آتسہ اردشیر کی ماں خود ملک زادی تھی اور بڑے تعلقہ کی عورت تھی۔ دارا کے عقد میں بادشاہ ہونے کے بعد آئی تھی۔ دارا کی تخت نشینی کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے مگر یہاں اس کا محل نہیں۔ گروٹ نے بڑی چھان بین اور تحقیق کے بعد تفصیل سے لکھا ہے۔

اردشیر نے سریر آرا ہوتے ہی "اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند" کی تکمیل پیشِ نظر رکھی۔ اور مہم مغرب کے لوازم کے اہتمام بڑے وسیع پیمانے پر جاری رکھے اور علاوہ تمام ایشیا سے فوج فرا اور سامان حرب مہیا کرنے کے، ہر مطیع و منقاد ملک سے ساز و سامان طلب کیا۔ مگر اسی دوران میں مصر میں بغاوت ہو گئی۔

قدیم مصر کا آخری فرعون اماسیس (یونانی نام) یا احمیس تھا اس کے بعد کیروس کے جانشین کیمبوجی کے زمانے میں مصر مغلوب ہو گیا تھا۔ اور ایرانیوں کا مصر میں تسلط ہو گیا تھا۔ مصر قدیم کے شمالی حصے میں ایک ہزار بارہ سو سال پہلے بھی صحرائے عرب کے خانہ بدوشوں نے ایک دو سو برس

کے لیے اپنا سکہ جما لیا تھا۔ جسے چرواہوں کی حکومت کہا جاتا ہے۔ ورنہ اس وقت تک پانچ چھ ہزار برس میں فراعنہ مصر قدیم کی فرمانروائی میں فرق نہیں آیا تھا۔ بلکہ ایک سات سو برس پہلے تو مصر کی شہنشاہیت ایران توران تو ایران توران، صفدانیہ اور باختریہ اور بلکہ اس سے آگے خطا و ختن کے آس پاس تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر لیل و نہار کا جھولا اسی طرح کبھی ادھر جاتا ہے کبھی اُدھر۔ حاکم محکوم اور محکوم حاکم ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ صرف ایشیائی اور افریقی ممالک کا حال نہیں رہا بلکہ مغرب کا بھی اور بڑے پیمانے پر مشرق و مغرب کا بھی، پہلے مشرق کا آفتاب مغرب پر چمکا اور اب پچھلے چار یا تین سو برس سے مغرب مشرق پر خندہ زن ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگلا دور اور کیا نئے گل کھلائے گا۔ بہر حال روس تو مشرق ہی کی اولاد ہے اور آج اس نے مغرب کو اپنا لوہا منوا ہی دیا ہے۔

جو فراہمی سامان حرب اور تیاری جنگ دارائے اعظم کے حکم سے جاری تھی وہ مصر کی روگردانی اور بغاوت کے وقت اردشیر کے کام آئی اور بغاوت فرو کرکے اردشیر نے اپنے بھائی اشیمن یا ایکیمن کو مصر کا نائب السلطنة مقرر کر دیا۔

دارا کے انتقال کے بعد کئی برس نکل گئے. بالآخر اردشیر کے مصاحبوں اور ندیموں نے اور بالخصوص یونانی جلاوطنوں نے جن میں سپارٹہ کا دیمارلیطرث اور اثینیہ کے پیسسترادی وودمان کے جلاوطن حکمراں بھی تھے۔ نوجوان اور نوزور بادشاہ کو مہم یونان بلکہ صحیح معنوں میں مہم مغرب اور فتح یورپ کے لیے آمادہ کیا۔ اور اس نے ظاہر کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ "میں اقلیم ایران کو اُفق خورشید کی سرحدوں سے ملا کر خداوند زیوس کے ایثر سے ملا دوں۔" مگر

اس آمادگی کا بھی عجیب قصہ ہے جس کو ہر دوط نے ایک افسانہ نگار کے رنگیں قلم سے لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غالباً ایشیائی اور مشرقی دنیا سے بڑھ کر خود یونان اور اس زمانہ کے مہذب مغرب میں مذہبی توہمات، نجوم، رمل، شگون لینے اور خوابوں کی تعبیریں نکالنے کا اس درجہ چرچا تھا کہ قدم قدم پر نیاز نذر، قربانی صدقہ ہوتا تھا۔ منجم اور ساحر درباروں میں متعین تھے اور خواب کی تعبیر بتانے والے اور پیش گوئیاں کرنے والے موجود رہتے تھے۔ حقیقت میں یہ تمام قصہ تھا تو مصر قدیم کی اختراع کیونکہ وہاں پچیس ہزار برس سے ایک شاندار اور حیرت انگیز تمدن تہذیب اور مذہبی زندگی کا دور مسلسل آ رہا تھا اور مہلت زندگی نے دنیاوی امور پر پوری فتح حاصل کر کے دینی روحانی اور ماورائے اجسام خیالی دنیا کو چھانا بینا تھا اور جو امور ایسے تھے کہ فہم عامہ سے بعید تھے ان پر بڑی بڑی عرق ریزیاں اور معنی آفرینیاں کی تھیں۔ چنانچہ جیوتش، رمل، جفر، نجوم وغیرہ وغیرہ مضامین کو بڑا پھیلایا تھا اور یہی حال اور تمام قدیم ممالک اور اقوام کا تھا کہ توہمات کا نام انھوں نے مذہب اور روحانیت قرار دے دیا تھا۔ فراعنہ بغیر شگون کے قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ ادھر تمام یونان اور ایشیا اس مرض متعدی میں مبتلا تھا۔ ہر خاص موقعہ اور اہم واقعہ تاریخ سے پہلے دیوتا خوابوں میں بشارت یا تنبیہ کرتے تھے۔ چنانچہ فرعون کے خواب اور یوسف کنعانی کی تعبیر کا قصہ موجود ہے۔ ضحاک کے خواب کا قصہ موجود ہے۔ بلشازر (یا ابو الشاذر) کے خواب اور دانیال کی تعبیر کی داستان بھی موجود ہے۔ اسی طرح یونان میں تو متعدد مشہور خوابوں کا افسانہ چلتا ہے۔

بہر کیف ہرودوط کا بیان ہے کہ جب اردشیر نے مہم یونان کا فیصلہ کر لیا تو بزرگان و عمائدین ایران کو مشورہ اور ان کے روبرو اپنے ارادے کو ظاہر کیا تو بھلا شہنشاہ اپنے ارادے کا اعلان کرے تو کس کی مجال تھی کہ "خداوند عالم بجا و درست" کے علاوہ بھی لب کشائی کرے۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مطلق العنانی کی شہرت کے مشرق کے حکمراں مشورہ اور صلاح کو ضروری سمجھتے تھے اور جہاں تک تاریخ کے صفحات اور واقعات نظر آتے ہیں ماسوائے چند خاص مستثنیات کے اور سب فرمانروا شوریٰ اور صلاح کو ضروری سمجھتے آئے ہیں۔ بہرصورت اردشیر کے مہم یونان کا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد خسرو خاور کے چچا اردبان نے عرض کی کہ یہ ارادہ درست نہیں ہے اور دلائل پیش کیں۔ بادشاہ ناراض ہوا اور درشت الفاظ زبان پر لایا۔ مگر راتوں رات غور و خوض کر کے ارادہ بدل دیا اور دوسرے دن دربار میں اردبان سے درشت کلامی پہ اظہار افسوس کیا اور تبدیلی ارادہ کا اعلان کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان سب کے جنھوں نے منصوبے گانٹھ رکھے تھے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک شخص کا ذکر لازمی ہے جہاں یونانی خوشامدی اور خود غرض اور بہت سے منصوبے تیار کیا کرتے تھے ایک یہ طریقہ بھی انھوں نے بادشاہ کو ترغیب دینے کا نکالا کہ پیش گوئیوں کا طومار باندھ دیا ایک شخص اونوسقراطیس کو جس نے زمانۂ قدیم کے تمام پیش گو درویشوں اور بزرگوں کی پیش گوئیوں کا ایک ذخیرہ جمع کر رکھا تھا (اور جو خود ان میں طبع زاد اضافے کرتا رہتا تھا اور ایک مرتبہ اس حرکت کا راز کھل جانے پر جلاوطن کر دیا گیا تھا) دربار شاہی میں لے آئے اور بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ اس نے اپنے ملک کے شہرۂ آفاق پیش گو باقیس اور دیگر

درگاہوں اور زیارتوں کے نبیوں کی پیش گوئیاں (من گھڑت یا جو بھی تھیں)
بادشاہ کو سنائیں اور یقین دلایا کہ اگر آپ یونان کی تسخیر کا ارادہ فرمائیں گے
تو وہ ہماری ان پیش گوئیوں کے مطابق ہوگا۔ مگر ہردوط کا قول ہے کہ وہ
ان پیش گوئیوں کا وہ حصہ دبا گیا جس میں ایران کی ہزیمت کا ذکر تھا۔
گویا خود غرضوں نے یہاں بھی فریب سے کام لیا۔ بہرحال اردبان عم خود
اور مشیر سلطنت کے مشورے سے اردشیر نے مہم یونان کا ارادہ تو فسخ کر دیا
مگر اسی رات اس نے خواب دیکھا کہ ایک پُر جلال پیر مرد اس سے
کہتا ہے کہ تو نے یونان پر لشکر کشی کا خیال کیوں چھوڑا اور اس کے بعد
بہت کچھ خوف دلایا۔ دوسرے دن پھر وہی خواب دیکھا اور تیسرے دن
پھر۔ مجبور ہو کر اس نے اردبان سے کہا کہ دیکھو تم نے مجھے متنبہ کیا تھا اور
میں خود بھی اس ارادے کو ترک کر چکا تھا مگر تین دن سے یہ خواب دیکھ
رہا ہوں اور یہ پیر مرد مجھ پر ناراض ہو رہا ہے۔ اگر تم میرے جامے کو زیب تن
کرو اور میرے شاہی شبستان میں سوؤ تو یقیناً تم کو بھی یہی خواب دکھائی
دے گا۔ بادشاہ کا جامہ اور تاج پہننا جرم کبیرہ تھا اور ایسا مجرم واجب القتل
تھا مگر حکم حاکم مرگ مفاجات اردبان کب عدول حکمی کر سکتا تھا۔ عرض معروض
کی اور کہا کہ خواب دو قسم کے ہوتے ہیں ایک سچے اور سماوی اور دوسرے
جھوٹے اور سفلی۔ شیطان بھی وسوسہ میں ڈال دیتا ہے مگر ایک پیش نہ گئی۔ بالآخر
اس نے جامہ شاہی پہنا اور خوابگاہ شاہی میں لیٹا۔ وہ پیر مرد خواب میں
آیا اور اردبان کو اس درجہ زجر و توبیخ کی کہ وہ چیخ اٹھا اور فوراً اردشیر کی
خدمت میں حاضر ہوا اور کل ماجرا کہہ سنایا اور عرض کی کہ جب حکم ایزدی یہی
ہے تو پھر اور سب دنیاوی مصالح بیکار اور مہمل ہیں اور مہم کی تیاری از سر نو

شروع ہوگئی ۔

ہرودوط کے قول کے مطابق اردشیر نے پھر روانگی سے پہلے ایک اور خواب بھی دیکھا جس میں تنبیہ تھی مگر اب معاملہ طول کھینچ چکا تھا اور یہ تنبیہ وسوسۂ شیطانی قرار دے کر نظر انداز کردی گئی ۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ اس واقعہ کی اصلیت کیا ہے ۔

اب تیاریٔ مہم کی یہ صورت تھی کہ اردشیر نے یہ حکم صادر کیا تھا کہ ابنائے ہیلیہ (درہ دانیال) پر ایک کشتیوں کا پل تیار کیا جائے اور آگے ایک مقام پر کوئی پون میل کی ایک خاکنائے میں سے نہر کاٹی جائے ۔ یہ دونوں کام حیرت انگیز تھے ۔ کیونکہ آبنائے ہیلیہ ایک نہایت پر آشوب مجمع البحرین ہے جو اس زمانے کے بادبانی جہازوں کے لیے خطرناک تھا اور اس پر پل باندھنا بظاہر قوت انسانی سے باہر تھا ۔ باسفورس پر جو نسبتاً تنگ تر مقام ہے پل بندھ چکا تھا اور خود دارا نے دریائے ڈینیوب کے دہانہ اور گویا باسفورس کے ایک حصہ پر معرکہ بدیہ کے موقعہ پر پل بندھوایا تھا ۔ مگر یہ تجویز نہایت ہی حیرت انگیز تھی ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے یہ کام مصری اور فنیقیوں کے سپرد ہوا ۔ کیونکہ ان کو اس قسم کے کام کا ماہر سمجھا جاتا تھا ۔ مگر انھوں نے کچھ غلطی کی یا طغیانی بلا کی ہوئی اور پہلا پل ٹوٹ گیا ۔ ابھی لشکر نے کوچ نہیں کیا تھا ۔ اس خبر کے آنے پر اردشیر بہت خشمگیں ہوا اور ان انجینیروں کو جن کی غلطی قرار پائی سخت سزائیں ملیں ۔ ہرودوط کہتا ہے کہ ان کے سر قلم کرادیئے مگر بعض اور کہتے ہیں کہ صرف ناک کان کٹوا دیئے اور دوبارہ پل کی تیاری شروع ہوئی ۔ یونانی مورخ کہتے ہیں کہ اس بار یونانیوں کے سپرد یہ کام ہوا یعنی ان یونانیوں کے جو مطیع اور رعایا تھے ۔ انتظام یہ کیا گیا کہ

ایشیائی ساحل سے یورپ کے ساحل تک جہاز برابر برابر کھڑے کیے گئے اور بیچ میں دو یا تین موقعوں پر چھوٹے موٹے جہازوں کے نکلنے کا راستہ چھوڑا گیا۔ کناروں پر بڑے بڑے ستونوں سے بڑے موٹے موٹے سن اور بانس کے بانوں کے رسّے مصر اور فینقیہ میں تیار کرائے گئے، چھ چھ سن کے اور چھ چھ بانس کے بان کے رسّے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جہازوں میں پرو پرو کے جہازوں کو جکڑ دیا گیا اور ان کے اوپر تختہ بندی کر کے مٹی کی سڑک تیار کر دی گئی اور چونکہ گھوڑوں اور چوپایوں کو بھی ان پر سے گزرنا تھا دو رویہ سڑک کے کنارے قد آدم بلکہ گھوڑے کے قد کے برابر تختہ بندی کر دی گئی تاکہ جانور پانی دیکھ کر ڈریں اور چمکیں نہیں۔

پہلے تمام لشکر ساحل کے قریب جمع کیا گیا۔ جس میں بقول ہر دوط چھیالیس قوموں کے عساکر موجود تھے اور بحری بیڑے میں آٹھ اور قومیں تھیں۔ ان کی پوری تفصیل دی ہے۔ تمام افواج بری کا اندازہ مختلف بیان کیا گیا ہے۔ جس کا یقین کرنا دشوار ہے یعنی ہر دوط کے قول کے مطابق سترہ لاکھ پیادہ فوج، اسی ہزار سوار، اور بار برداری وغیرہ نیز سامان رسد اور کیا اور کیا لے جانے والے ہمراہیان سب کی تعداد ملا کر باون لاکھ تراسی ہزار کا لشکر تھا یا اس سے بھی کہیں زیادہ، کیونکہ لنگر کے طباخ، ملازم اور پھر سرداروں کے اہل خانہ وغیرہ وغیرہ اس پر بارہ سو سے زیادہ جنگی جہازوں کا اور تین ہزار اور باربرداری کی کشتیوں کا بیڑہ۔ غرضیکہ بالکل خلاف قیاس تعداد بتائی جاتی ہے۔ جس کا گروٹ بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ اگرچہ رسد کے ذخیروں اور خیمہ و خرگاہ کا اہتمام برسوں سے ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی اتنی بڑی جمعیت کے کھانے پینے اور رہنے اور سفر کا انتظام آج بھی عقل سے بعید

معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کہ ہم یہ یاد رکھیں کہ اس کے مقابلے میں آزاد یونان کی تعداد کل آبادی ملا کر بھی شاید اتنی مشکل سے ہوتی اور جنگی تیاری تو اس کے مقابلے میں شہباز اور پودنہ کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ بہر صورت یونانیوں نے اپنی قومی فخاری کے زور میں اس لشکر کو بالکل ایک خلاف قیاس فراوانی بخش دی ہے تاکہ ان کی فتح اور ایرانی لشکر کی پسپائی ایک معرکۂ عظیم نظر آئے۔ معرکہ ضرور عظیم تھا مگر نہ اتنا کہ سارا ایشیا ایک ضلع پر ٹوٹ پڑا بہر صورت جو قومیں اس ایرانی مہم میں شریک تھیں ان میں کشور ایران کے کونے کونے سے آدمی موجود بیان کیے جاتے ہیں اور ان میں سندھیوں، بلوچوں، سرحدی پٹھانوں اور ہندوستانیوں کا بھی ذکر ہے۔ اور ان کے علاوہ باختر خطا و ختن، زابلستان، کابلستان، سیستان، مازندران، خوارزم، قفقاز، توران، ماوراء النہر، بابل، کلدان، قصے، لیبانی، عرب، حبشی، مصری، ایشیائے کوچک کی ہر قوم ایرانی، زنادقہ اور مجوسی وغیرہ وغیرہ سب موجود ہیں اور اسلحہ کا بھی عجیب حال ہے کہ تیر و کمان، تفنگ و خدنگ، تیغ و تبر، نیزہ و سنان، گرز و لیزم، غرضیکہ ہر اس ہتھیار اور ہر اس آلۂ حرب کا ذکر ہے جو اس زمانے میں رائج تھا۔ جنگی رتھوں کا جس میں گھوڑے جتے تھے ذکر ہے اور قبرص کی جنگی رتھیں جن کے پہیوں میں چھُرے جڑے ہوئے ہوتے تھے تاکہ کوئی قریب نہ آسکے وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام لشکر قلسقیہ (سائیلیشیہ) میں جمع کیا گیا اور وہاں سے کچھ فوج بحری بیڑے میں روانہ ہو کر قبرص والوں اور فنیقیوں کو اکٹھا کر کے چلی اور کچھ خشکی کی راہ سے۔ شہنشاہ اردشیر خود سوسہ سے دس ہزار خاص ایرانی جانبازوں کو لے کر جو "زندۂ جاوید" کہلاتے تھے روانہ ہوا اور یہ ظاہر

ہے کہ روانگی کے وقت محلات شاہی میں طرح طرح کی نیاز نذر اور قربانیاں ہوئی ہوں گی اور نہ معلوم اور کیا کیا رسوم ادا ہوئی ہوں گی۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ ایسکلس نے "پارسی" میں یہ دکھایا ہے کہ اردشیر کی ماں آتسہ نے دارا کی روح سے اردشیر کی شکایت کی کہ اس نے خواہ مخواہ اس مہم کا ارادہ کیا اور دولت ایران کو برباد کیا۔ مگر جیسا کہ گروٹ کہتا ہے حقیقت میں ابتدا میں خود آتسہ نے ہی دارا کو بھی اس مہم پر آمادہ کیا تھا۔

شاہی عسکر اور شاہی سواری کوچ مقام کرتے ہوئے صاردیس پہنچے اور وہاں سے قدیم شہر طروئے۔ جس کی قدیم جنگ یونانی مہابھارت ہو گئی تھی۔ یہاں بحری اور بری افواج کا معائنہ کیا۔ دیوی دیوتاؤں کی نذر کی اور قربانیاں کیں، یہ نظارہ اتنا شاندار بیان کیا جاتا ہے کہ دیکھنے والوں پر بہت بڑا اثر ہوا۔ ہفت اقلیم کے تاجدار اور سپاہ کا اجتماع یقینی طور پر ایک حیرت انگیز نظارہ ہو گا۔ آگے بڑھ کر جہاں پل تیار ہوا تھا پھر نیاز نذر اور قربانیاں کی گئیں۔ اور شہنشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے ایک طلائی مجمر میں عود سلگا کر نیاز میں حصہ لیا اور ایک ایرانی شمشیر اور طلائی زنجیر آبنائے کے نذر کی۔ پھر لشکر نے عبور کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ متواتر شب و روز سات دن تک لشکر پل سے گزرتا رہا۔ اس موقع کا قصہ ہیرودوطس نے اس طرح قلمبند کیا ہے کہ گویا وہ خود موجود تھا۔ یوں تو ایرانیوں کے خاص حربوں میں تیر کمان سب سے زیادہ موثر حربہ تھا۔ مگر ان کی جنگی رتھیں کچھ کم نہ تھیں۔ اور بالخصوص ان کا رسالہ دشمن کا زہرہ آب کرنے میں بڑا موثر تھا۔ وہ دس ہزار "زندہ جاوید" جانباز ایرانی جو شہنشاہ کے خاص الخاص

محافظ تھے۔ بڑی شان وشوکت کے شہسوار تھے۔ خود زرہ میں اور گھوڑے برگستواں میں عرق اوران کے نیزوں کی موٹھوں میں سنہری انار جڑے۔ اوران میں بنفشئی، زرد اور سُرخ رنگ کی پٹیوں کی جھنڈیاں ہوا میں اُڑتی ہوئی، فیلتن گھوڑوں پر سوار ایک عجیب شان کے سپہ گر تھے۔ آبنائے کے پار یورپ کی سرزمین میں خیمہ وخرگاہ کا انتظام تھا، اس لشکر کے سفر اور شہنشاہ کے کوچ مقام کے بہت سے دلچسپ قصے ہیں۔ جن کا ہر دوط قسطیسیہ اور گروٹ کی تاریخوں میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

ادھر یونان نے ہر قبیلہ اور ہر حکومت، ہر علاقے اور ہر جزیرے سے امداد طلب کی تھی اور ایک فوج جرار، بحری اور بری مقابلے کے لیے تیار کی تھی۔ مگر یونانی ماراثون کے معرکے تک تو بالکل غیر متحد تھا بلکہ آپس کی رقابتوں اور تنگ نظر غرور اور زعم میں غرق تھا۔ مگر ماراثون کے معرکے کے بعد سے ایک قسم کا وفاقی جذبہ اور اتفاق واتحاد کا چرچا شروع ہو چکا تھا اور اس موقع پر ایرانی غنیم کی خبروں نے جو تیاری کے دوران میں کم سے کم تین چار برس سے مشہور ہوں گی ایک قومی خطرے کا متحدہ قوت سے مقابلہ کرنے کی ترغیب دی ہوگی۔ چنانچہ سپارطہ اور اثینیہ کی رقابتوں کو دفن کر دیا تھا اور ہر طرف سے اثینیہ کی کوششوں کو لبیک کہا جا رہا تھا۔ بالآخر روز کارزار قریب آجانے پر چاروں طرف سے جوق درجوق یونانی یا ہلینی نسل کے لوگ معرکے میں شرکت اور وطن وقوم کو اس آفت سے بچانے کے لیے آ گئے تھے۔ یونانی طریقہ حرب اور یونانی انداز جنگ اور جنگی داؤں گھات میں بین فرق تھا۔ ایرانی شہسواری، نیزہ بازی، تیراندازی اور شمشیر زنی کے دھنی تھے اور ایرانی سپر (جو قدآدم بید کی بنی ہوئی ہوتی

تھی) اور یونانی برچھے بھالے سے لڑتے تھے اور ان کی ڈھالیں دھات کی ہوتی تھیں۔ ایرانی شہسوار اور ان کے گھوڑے فولادی زرہ کے بوجھ میں بھاری ہو جاتے تھے اور یونانی ہلکی خفتان کی وجہ سے چست وچالاک رہ کر لڑتے تھے۔ پھر داؤں گھات کے معاملے میں بھی فرق تھا۔ اگرچہ باقی نظم و ترتیب میدان دو طرفہ وہی تھی کہ آگے مقدمتہ الجیش، پھر چپ و راست اور قلب لشکر۔

خیر یونانیوں نے جنگ کا یہ نقشہ جمایا کہ فوج کا بڑا حصہ تو میدان میں چھوڑا اور مشہور آفاق ٹرموپلی (تھرموپلی) کے درے کو جانبازوں سے گھیر لیا تاکہ حملہ آور کو کمینگاہ کے دروازے ہی پر جہاں راہ تنگ اور کٹھن تھی ایک تھوڑے سے لشکر ہی سے روک لیا جائے۔ یہ گھات بلاشبہ بہت کامیاب تھی۔ مگر اس سے پہلے اتنا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ معرکہ شروع ہونے سے پہلے یونانی سپہ سالاروں اور سرداروں میں کافی اختلافات تھے اور ایک سے زیادہ موقعے ایسے آئے کہ سارا نقشہ درہم برہم ہوتا نظر آیا۔ نمود و نمایش کے جذبے پر آپس کی رقابتیں ایسی گہری تھیں کہ میدان جنگ میں بھی کام کرتی رہیں اور اسے صرف مقدر کہنا پڑے گا کہ بالآخر جب رن پڑا تو سب نے داد شجاعت دی۔

تھرموپلی کے مقام پر شدید کشت و خون ہوا اور ابتدا میں کثیر تعداد میں ایرانی جاں باز کام آئے۔ پھر اردشیر کو تاب نہ رہی اور وہ خود ایک اونچے مقام پر جا کر ٹھیرا اور معرکہ خود دیکھنے لگا پھر کیا تھا ایرانیوں نے اپنے دشمن کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ اور ایسا میدان کارزار گرم ہوا کہ ماسوائے گیارہ آدمیوں کے ایک ایک یونانی کھیت رہا۔ میدان میں بھی اس کے بعد یونانیوں نے داد جاں بازی دی اور جی توڑ کے لڑے۔ مگر قسمت نے

یاوری نہ کی اور ایرانی غنیم غالب آگیا۔ اس کے بعد راستہ کے علاقوں کو فتح کر کے اردشیر کا لشکر خود اثینیہ پہنچ گیا اور اسے فتح کیا۔ فوراً سوسہ خبر بھیجی گئی اور وہاں بڑے شادیانے بجے۔ ایسکلس کا بزرگان ایران سے یہ کہلوانا کہ جس دن سے بادشاہ اور لشکر سوسہ سے گیا ہے نہ خیر ہے نہ خبر ہے۔ سراسر شاعری اور تاریخی واقعے کے خلاف ہے۔

یہ تو خشکی کا نہایت مختصر قصہ ہوا۔ ادھر بحری جنگ کا معاملہ درپیش تھا کیونکہ اگر بحری جنگ میں یونانی بیڑے کو شکست نہ ہوتی تو یہ فتحیابی بیکار تھی۔

بحری جنگ کا قصہ تو طویل ہے مگر مختصراً یہ ہے کہ یونانی مورخوں کے قول کے مطابق اردشیر کے بیڑے میں ایک ہزار سے زیادہ جہاز تھے۔ اور یونانیوں نے بھی ساڑھے تین سو جہاز جمع کر لیے تھے جب بری شکست کی اطلاع پہنچی تو یونانی بحری امرا نے مشورہ کیا اور بالآخر یہ طے کیا کہ ہم تاب مقاومت نہیں لا سکتے اور ہمیں منتشر ہو جانا چاہیے۔ مگر اس فیصلے سے اثینیہ کے جمہوری قائد کے چھکّے چھوٹ گئے مگر اس نے بڑی ہوشیاری اور حکمت عملی سے اس فیصلے پر راتوں رات نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کرا دیا۔ بڑی رد و قدح ہوئی اور اگرچہ اس نے جم کر لڑنے کا فیصلہ ضرور کرا دیا مگر اتنے ہی میں خبر آئی کہ اثینیہ فتح ہو گیا اور ایرانی قابض ہو گئے۔ اس خبر نے بُرا اثر کیا اور ثیمستاقلیس ڈرا کہ کھیل بکھیر نہ ہو جائے اور جنھوں نے اختلافِ رائے کیا ہے کہیں اپنے اپنے بیڑے لے کر گھر کو نہ روانہ ہو جائیں اس لیے اس نے اپنے ایک آدمی کو اردشیر کے لشکر میں بھیجا اور یہ اطلاع بھیجی اور خود اپنے نام سے بھیجی گویا وہ شہنشاہ کا خیر خواہ ہے (اس پر بحثیں ہیں کہ

آیا اس نے یہ حفظ ما تقدم کی غرض سے کیا تھا یا اردشیر کے بیڑے کو پھانسنے کی غرض سے) اور یہ موقع اچھا ہے یونانی بیڑہ اس وقت سالامیس کی بندرگاہ کے پاس سالامیس کی آبنائے میں پھنسا کھڑا ہے۔ اگر حملہ اس وقت نہ ہوا تو یہ سب خائف اور دلبرداشتہ ہیں راہ فرار اختیار کریں گے اور یونان کی فتح کا خواب ختم ہو جائے گا۔ یہ انتظام کیا جائے کہ آبنائے کے دونوں ناکوں پر ایرانی جہاز متعین کر دیے جائیں کہ کوئی نکل کر جانے نہ پائے۔ حالت نازک تھی اور ادھر خشکی پر اور ادھر سمندر میں جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ مگر اس گھات میں اس کی مصلحت یہ تھی کہ ایرانی بیڑہ اتنا بڑا ہے کہ سالامیس کی تنگ آبنائے میں اس کا سمانا ناممکن ہے اور جس وقت بیڑہ ادھر آئے گا، ہم ایک ایک دو دو کر کے ان سب کو سنگوالیں گے اور بالآخر میدان نہیں بلکہ سمندر ہمارے ہاتھ رہے گا اور اس کا یہ خیال بڑی دور اندیشی پر منحصر تھا۔ ورنہ کام تو تمام ہو ہی چکا تھا اور محض اتنی دیر تھی کہ یا تو یونانی بیڑہ منتشر ہو جائے یا مغلوب۔ اگر کھلے سمندر میں یہ معرکہ پیش آتا تو کہنا دشوار ہے کہ یونانی ٹھیرتے یا مغلوب ہو جاتے۔

بہرکیف تھیمستاقلیس کا یہ پیام پہنچتے ہی اردشیر نے امیر البحر کو لنگر اٹھاتے اور صبح ہی یونانیوں پر حملہ کرنے کا حکم صادر کر دیا اور اس کے خلاف ایک مشورہ نہ مانا بقول گروٹ اگرچہ یہ فیصلہ اس پیام کے پہنچنے سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ چنانچہ ایرانی یعنی فنیقی، مصری، قبرصی اور آئیونی جزائر کے جہازوں نے مقام کارزار کا رخ کیا اور رات بھر شب شب چپو چلتے رہے اور بادبان اور پھریرے اڑتے رہے۔ ملاح اور فوجی گیت گاتے اور سفر کو ہلکا کرتے رہے۔ اس دوران میں بدقسمتی سے کبھی واسطہ پڑا۔ سمندر

طغیانی پر تھا اور راہ نہایت خطرناک تھی۔ بادِ مخالف آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ چنانچہ اس سفر میں بیڑہ کا ایک معقول حصہ اس طغیانی کی نذر ہوا یا بیکار ہو گیا۔ صبح ہوتے ہی ایرانی جہاز آبنائے سالامیس کے سامنے پہنچے تو دیکھا کہ پورا یونانی بیڑہ بادِ تند سے محفوظ دو طرفہ پہاڑوں کی پناہ میں سالامیس کی کھاڑی میں کھڑا ہے۔

اردشیر نے سالامیس کے مقابل کنارہ کی ایک پہاڑی پر ایک تختِ زرنگار، چھتر پوش تیار کرایا تھا کہ وہاں سے مع اپنے مصاحبوں اور سرداروں کے اس بحری جنگ کا حال دیکھے اور اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ جنگجوؤں میں شاہی نظروں کے سامنے شجاعت کے کارنمایاں انجام دینے کی خواہش دوبالا سہ بالا ہو جاتی ہے۔ ہوا ایرانی بیڑے کے بالکل خلاف تھی اور آبنائے کا وہ مقام جہاں یونانی پناہ گزین یا معرکہ کے لیے آراستہ تھے بادِ مخالف سے بالکل محفوظ تھا اور آبنائے کی تنگی کی وجہ سے ایرانی بیڑے کے بڑے جہاز بہ آسانی حملہ آور نہیں ہو سکتے تھے اور بلکہ اتنی بھیڑ ہو گئی تھی کہ دوست دشمن کی تمیز مشکل ہو گئی تھی اور کافی نقصان محض اس وجہ سے ہوا کہ ایران کے سہ منزلہ بڑے بڑے جہاز تو ہاتھیوں کی طرح پھنسے کھڑے رہے اور یونان کی سبک کشتیوں نے ان پر بھِڑوں تتیوں کی طرح متواتر وار کیے۔

مختصر یہ کہ سالامیس کا بحری معرکہ ایرانی بیڑے کے خلاف گیا، اور کارپردازانِ قضا و قدر نے یونان کا نہیں بلکہ یورپ بلکہ مغرب کی قسمت کا صدیوں کے لیے وہ فیصلہ کیا جس کی خوشگواری سے مغربی کام و دہن آج تک شیریں ہیں۔ اردشیر کے بیڑے کو ہزیمت ہوئی اور بڑی کاری

ہزیمت ہوئی اور یونانی بیڑے کو فتح ہوئی اور بڑی تاریخی اور شاندار فتح۔ مگر مورخوں کا بیان ہے کہ بعض بعض شجاعوں نے ایرانی صف میں سے حیرت انگیز جرأت اور دلاوری کا ثبوت دیا۔ اور ان میں ایرانی صف کی ایک یونانی شاہزادی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو قاریہ کی فرمانروا ملکہ آرتیمشیہ اور اردشیر کی وفادار مصاحب اور مشیر تھی۔ اسی شاہزادی کو یہ جرأت تھی کہ اس نے اس معرکے سے پہلے اردشیر کو متنبہ کیا تھا۔ اس نے بہ نفس نفیس اپنے جہاز کی سرداری اور ناخدائی کی اور پانچ یونانی جہازوں کو اردشیر کے زیر نظر گرفتار کیا۔ یونانیوں نے بھی داد شجاعت دی اور ایک ایک جان توڑ کے لڑا۔ اردشیر کا بھائی اور اس کے چیدہ امرائے بحر اور بعض بڑی سالار اس معرکے میں کام آئے۔ مگر بایں ہمہ یونانیوں کو ایسا گہرا زخم پہنچا تھا کہ اگر تقدیر نے فیصلہ ایران کے خلاف نہ کر دیا ہوتا اور معرکہ جاری رکھا جاتا تو یونانی بیڑہ ختم تھا اور باوجود طغیانی اور باد مخالف کی تباہ کاریوں اور سالامیس کی پہلے دن کی شکست کے ایرانی بیڑہ پھر بھی اتنا کافی تھا کہ ایک معرکہ ہونا ناممکن نہ تھا۔ مگر پرانے زمانے کی لڑائیوں کا عجب حال تھا کہ عموماً پہلے ہی دن کے مقابلے کے نتیجے پر شکست و فتح کا دارومدار ہوا کرتا تھا۔

ایسکلس نے اس تمام واقعے کو بڑا رنگا ہے۔ اور بالکل اُلٹ کر دکھایا ہے مثلاً اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ گویا تمام یونانی بیڑہ متفقہ طور پہ ایرانی بیڑے کے مقابلے پر جما ہوا تھا اور اردشیر کو فریب سے راتوں رات ایرانی بیڑے کو مقابل لے آنے پر مجبور کر دیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اثینیہ کی فتح کی خبر کے بعد یہ سب فرار ہو جانے پر کمر بستہ تھے اور تمیستاقلیس نے اپنا خفیہ پیامبر بھیجنے کے بعد یہ چال چلی کہ اپنے سرداروں کی بحث کو جتنا طولانی کیا جا سکتا

تھا کیا، اور بڑی رات گئے تک بحث جاری رکھی کہ اتفاق سے یہ خبر پہنچی کہ آبنائے کے دونوں داخلوں کو ایرانی بیڑے نے گھیر لیا ہے۔ اس کے بعد فرار کا موقع ختم ہو گیا اور چار و ناچار مقابلہ کرنا پڑا۔

یہ صحیح ہے کہ اگرچہ نقصان کافی ہوا تھا پھر بھی ادھر تمام فوج موجود تھی اور ادھر بیڑہ بھی کافی تھا۔ کیونکہ اگر یونانی مورخوں کا اندازہ بھی مان لیا جائے تو یونانیوں کے چالیس اور ایران کے دو سو جہاز کام آئے تھے اور اگرچہ ایران کی چیدہ فوج کے خالص دلاوروں میں بہت سے کھیت رہے تھے مگر بقول گروٹ خود اردشیر کے سپہ سالار مردان (مارڈونیوس) نے بادشاہ سے جو اس ہزیمت سے سخت ناراض اور دلبرداشتہ تھا، کہا کہ حضور کیا ہے لشکر کا بیشتر حصّہ موجود ہے، خشکی پر کامیاب ہیں اور بحری بیڑہ میں سب بیرونی غلام تھے۔ ان نامردوں نے غداری کی ہے۔ حضور اب مراجعت فرماویں اور میں تین لاکھ فوج لے کر تمام یونان کو حلقہ بگوش کر لوں گا۔

اس خبر کے سوسہ پہنچنے پر سب کو رنج ہوا اور سب نے مردان کی نامردانگی کو قابلِ مذمّت ٹھیرایا۔ اردشیر میں باپ کی سی پختہ کاری اور فولادی ارادے کی کمی تھی۔ وہ اس خیال سے کہ کہیں درہ دانیال کا پل نہ توڑ دیں مردان کو مہم سپرد کر کے واپس روانہ ہو گیا۔

ایسکلس نے اس پسپائی کو بھی خوب رنگ دیا ہے اور اردشیر کے سفر معاودت وطن کا جو نقشہ کھینچا ہے بالکل غلط اور مبالغہ آمیز ہے۔ خود گروٹ نے بڑی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ راہ میں دریائے سطرائیمون جم گیا اور بڑا حصّہ لشکر کا برباد ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔ تین لاکھ کا لشکر جس میں

ہندوستانی سپاہ بھی تھی۔ سپہ سالار مردان کے ماتحت پیچھے رہ گئے کہ یونان اور قرب وجوار کے علاقہ کو فتح کریں۔ اور اردشیر واپس ہوا۔ واپسی میں اس کے ہمرکاب سالار اردبان یعنی اردشیر کا چچا اور ساٹھ ہزار فوج تھی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد کوچ مقام کرتے درہ دانیال پر پہونچے۔ سوسہ سے روانگی اور واپسی تک کل آٹھ ماہ کی مدت صرف ہوئی۔ واپسی پر درہ دانیال کا پُل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اس لیے بقیہ جہازوں پر آبنائے ہیلیہ عبور کی گئی۔ راہ میں کچھ افواج بیاری بیماری کی وجہ سے چھوڑ دینی پڑیں۔ مگر گروٹ کا قول ہے کہ یونانی اور ان کے بعد لاطینیوں نے بھی محض قومی فخاری کے زور میں اس مراجعت کو اس درجہ کذب بیانی اور خیالی باتوں سے رنگا ہے کہ ان کو یقین کرنا ناممکن ہے اور غالبا اس میں سب سے بڑا حصہ ایسکلس اور دوسرے ہمعصر شعرا کا بھی ہے کہ انھوں نے یہ رنگ آمیزیاں اور مبالغہ آرائیاں کی ہیں۔

مگر ایسکلس کے "پارسی" کے مطالعے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مبالغہ آرائی کے ایرانی اقتدار اور ہیئت کا کافی رعب باقی تھا اور اسی لیے ایک طرف دارا کی مدح سرائی کی ہے اور دوسری طرف یہ ظاہر کیا ہے کہ خدا نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے اس پر قناعت کرو اور حرص میں آکر کفران نعمت نہ کرو اور مقدس اثینیہ پر پھر نظر نہ کرنا۔ ایران اقتدار تو اس کے بعد بھی سالہا سال یونان میں قائم رہا۔ گو زوال ضرور شروع ہو گیا تھا۔ بقول کسے ہاتھی لٹے گا بھی تو سوا لاکھ ٹکے کا ہوگا۔ اس ایرانی سلطنت اور شہنشاہیت کے ہاتھی کو لٹتے لٹتے بھی برسہا برس درکار تھے پورے پونے دو سو برس کے بعد یہ نوبت پہنچی کہ سکندر اعظم مقدونوی

نے پہلے یونان اور قرب وجوار کے علاقوں کو زیرنگیں کیا اور پھر کل ایران کی قدیم سلطنت کو مسخر کیا جس میں وسط ایشیا کا تمام علاقہ بھی آ گیا اور بلکہ دریائے سندھ کے اس پار بھی پنجاب تک وہ آ گیا۔

اس تمثیل میں کشور ایران کے کونے کونے کا ذکر آ گیا ہے چنانچہ مصر کا بھی ذکر ہے اور باختر کا بھی۔ چھٹی صدی قبل مسیح کے آخر اور پانچویں قبل مسیح کی ابتدا میں کشور ایران میں یہ ممالک شریک تھے۔ مصر تو کیروس کے بیٹے کمبوجی کے زمانے میں فتح ہو چکا تھا اور باختر اس سے پہلے۔

یہاں انتہائی اختصار سے کچھ تھوڑا سا ذکر ایران کے عروج کا اور خصوصاً دارا کے خاندان کے عروج کا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جہاں تک قدیم ممالک اور قوموں کی تاریخ کا تعلق ہے۔ یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بدقسمتی سے خود ان ممالک اور قوموں کی بے توجہی سے یا دست بردِ زمانہ اور انقلابات پے در پے کی وجہ سے براہ راست تاریخ ہاتھ نہیں آتی۔ دور کیوں جائیے خود اپنے ملک کو لے لیجیے کہ سوائے ایک مہابھارت اور رامائن اور پرانوں کے کہ جو کچھ اصل اور بہت زیادہ طبع زاد روایات اور خلاف قیاس داستانوں کا اٹھارہ جلدوں میں ایک ذخیرہ ہے باقی تاریخ کا ماخذ عمارتیں کھنڈر، سیاحوں کے بیانات اور بیرونی مورخوں کے حوالے اور بالآخر سکّے ہیں اور کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے زبانِ حال کی گویائی کو زندۂ جاوید اور روحانی یا تخیل کی ترقی اور اس کے نتائج کو قابلِ توجہ سمجھا اور باقی زندگی کے روزانہ مرحلوں اور قومی تاریخ کو محض آنی جانی اور مستعار شے گردانا اور اس لیے نظر انداز کیا۔ مگر قدیم قوموں اور ملکوں میں مصر قدیم کا یہ حال نہ تھا۔ نہ یونان کا۔ قدیم قوموں میں یہودیوں نے بھی اپنی تاریخ یا

تاریخی روایات کو قلمبند کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ نیز چینیوں نے۔ باقی اور سب گردزمانہ میں روپوش ہیں اور صرف ان کے آثار اور غیر ممالک کے سیاحوں اور مورخوں سے ان کے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پورے تیقن کے ساتھ ایران قدیم کی تاریخ کی نسبت کچھ کہنا دشوار ہے۔ شاہنامہ پہلوی اور زنادقہ کے ماخذوں سے قریب کیا گیا۔ اور محض روایات پر قائم ہوا جسے تاریخ کہتے ہیں اس کا اس پر پرچھاواں بھی نہیں پڑا۔ اس حالت میں موجودہ ایرانی ماخذ چنداں کارآمد نہیں۔ یوں ظاہر ہے کہ کیومرث، سیامک، ہوشنگ اور طہمورث اور جمشید کے بعد باقی جس کسی کا ایرانی تخت پر جلوہ افروز ہونا فردوسی نے لکھا ہے وہ ضحاک تازی کو چھوڑ کر تمام نسل فریدوں کیانی سے ہے اور آخر کا دور اردشیر بابکاں ساسانی سے لے کر دارا بن داراب تک ساسانی ہیں۔ اور وہ تو سکندر کو بھی داراب کا بیٹا اور دارا کا بھائی بتاتا ہے۔ سکندر مقدونوی کے بعد وہ دو سو برس اشکانیوں کی طوائف الملوکی لکھتا ہے اور پھر صحیح تاریخ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس تمام قصے کو کیروس پسر کمبوجی کا جس نے قدیم ایرانی سلطنت کی بنیاد ڈالی، نام تک نہیں۔ اور اس یونانی مہم کا پتہ نشان نہیں ملتا۔ حالانکہ یہ فردوسی سے صرف پندرہ سو سال کا واقعہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی تاریخ نابود ہو چکی تھی اور محض مشکوک روایات شاہنامے کا ماخذ تھیں۔ ایک اعتبار سے فریدوں کا قصہ ضرور ایک حد تک کیروس سے مشابہ ہے کیونکہ کیروس کی داستان یہ ہے کہ وہ شاہ ہشتیاگ یا استیاگ[1] فرماں روائے

---

[1] ہشتیاگ کے مورخوں میں بھی یونانیوں کے حوالوں کے مطابق "کے" ہوتے ہیں مثلاً وہ میدی بادشاہ جس نے ۶۱۲ قبل مسیح میں شاہ بابل سے مل کر نینوا پر حملہ کیا تھا کیاکسریز (میرے نزدیک یونانی "ایز" چھوڑ کر کیکادس) تھا۔

میدیہ یا ماد کا نواسہ تھا۔ ہشتیاگ کی بیٹی مندنی یاماندانی کی کیمبوجی یا کیمبوجہ سے شادی ہوئی تھی۔ ایران کے علاقہ پارس کے نام آور قبیلوں میں پارسگدہ کا قبیلہ خاص طور سے نام آور تھا۔ پارسگدہ یا پارسکدہ موجودہ اور قدیم پرسیپوس (یونانی نام) کے قریب ایک شہر تھا اور اس پارسکدہ کے خاندانوں میں ایک خاندان جسے یونانیوں نے اکیمنی یا اشیمنی لکھا ہے اور جو قطعی ممکن ہے کہ حقیقت میں کیمنی یا خاندان "کے" سے نسبت رکھتا ہو سب سے زیادہ ممتاز اور مقتدر تھا اور کیروس یا کے روس جسے یونانیوں نے کیرس لکھا ہے اور جو بعض محققین کے نزدیک گورش ہے اور جسے عبرانیوں نے "خورس" بتایا ہے اسی کیمنی خاندان کے کیمبوجی یا جیسے یہاں لکھا گیا ہے کیمبوجہر اور استیاگ کی بیٹی ماندانی سے تھا۔ استیاگ فرماں روائے میدیہ نے ایک خواب دیکھا اور اس سے متاثر ہو کر اس زمانے کے اعتقاد کے موافق اپنی لڑکی کی اولاد کو منحوس قرار دے کر حکم دے دیا کہ اسے پھنکوا دیا جائے۔ اتفاق سے یہ بچہ جہاں پھینکا گیا وہاں ایک بیاہی ہوئی کتیا پڑی تھی اور اس کتیا نے بچہ کو اپنا دودھ پلایا۔ اور پھر کسی نے اسے اٹھا کر پال لیا۔ اور بالآخر وہ کسی طرح اپنے ماں باپ تک پہنچ گیا اور بڑے ہو کر اس نے نانا کو تخت سے اُتارا اور خود حکمراں ایران و میدیہ ہوا۔ یہ قصہ ہر دوط نے تفصیل سے قلبند کیا ہے۔ اور یہ منجملہ اور قصوں کے ہے جو "کے روس" یا گورش کے متعلق مشہور ہیں۔ خیر یہی کیروس پھر بانی سلطنت ایران اور کیروس اعظم ہوا۔ اب فریدوں کا قصہ بھی ایک اعتبار سے ملتا جلتا ہے۔ فریدوں ایک گائے کے دودھ پر پلا، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ فردوسی کو یہ زیادہ قرین قیاس قصہ ملا۔ پھر شاہنامے میں فریدوں گاواں کیانی کے تین لڑکے، ایرج، تورج یا تور اور سلم ہوئے اور فریدوں نے سلطنت ایران ایرج اور

توران تور اور خاور یا وہ علاقہ جسے اب اناطولیہ کہتے ہیں سلم کو دی۔ اور تور اور سلم نے باہمی سازش کر کے ایرج کو قتل کر دیا اور بعد ازاں پھر ایران اور توران نیز خاور کے خاندانوں میں سخت لڑائیاں رہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس تمام قصے کے یہاں دوہرانے سے مراد صرف اتنی ہے کہ شاہنامے کی اس داستان سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ روایتاً بھی ایک ہی خاندان تھا کہ جس کی ایک شاخ تورانی اور دوسری خاوری ہوئی۔ اور تیسری شاخ جو منوچہر ایرج کے نواسے سے چلی وہ ایران خاص میں رہی۔ گویا ایرانی، تورانی اور خاوری شاخوں کا مورث اعلیٰ فریدوں کیانی ہی تھا۔ اور یہ بھی شاہنامے سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک اور جہاں تک ممکن ہوا ایران میں بادشاہت کے لیے کیانی خاندان ہی کے آدمیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نکالا جاتا رہا۔ چنانچہ اس بنیاد پر یہ قیاس بے جا نہیں کہ جسے یونانیوں نے پارسکدہ کا اکیمنی خاندان لکھا ہے وہ حقیقت میں کیانیوں ہی کی شاخ تھی۔ چنانچہ کیرؤس اور کیمبوجی میں جو "کے" آیا ہے وہ وہی کیانی "کے" ہے جو کیکاوس، کیخسرو، کیقباد وغیرہ ناموں میں نمایاں ہے۔ بہرکیف یہ محض قیاس ہے۔ ورنہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ خاندان پارسکدہ کا تھا۔ مگر فریدوں سے بھی زیادہ قریب مشابہت کیخسرو کے قصے سے ہے جو سیاوش کیانی اور افراسیاب کی بیٹی کا بیٹا تھا اور جس کی نسبت افراسیاب نے خواب میں دیکھا اور اسے پھنکوا دینے کا فیصلہ کیا مگر وہ افراسیاب کے وزیر کی دانشمندی سے بچ گیا اور بالآخر افراسیاب کو تخت سے اُتار کے توران کا بادشاہ ہوا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ افراسیاب کو یونانیوں نے استیاگ بنا دیا ہو؟ یہ امر محققین کی نگاہ کا محتاج ہے۔ ہم یہاں محض مسئلہ کو اس سوال پر چھوڑ دیں گے۔

دارا اے کیمنی کی تخت نشینی کا قصہ یوں ہے کہ کیروس اعظم کے جانشین اور لڑکے کیمبوجیہر نے جب مصر فتح کر لیا تو یہ واقعہ پیش آیا کہ مصر میں ایک عرصے کے بعد وہ گاو مخصوص جسے وہ خدائے آپیس کا اوتار مانتے تھے بمشکل تمام دستیاب ہوا۔ اس کے خاص خاص نشانات ہوتے تھے اور بڑی تلاش و تجسس سے وہ دستیاب ہوتا تھا۔ چنانچہ مصر بھر میں بڑی خوشیاں ہوئیں اور ایک قومی تیوہار منایا جانے لگا۔ کیمبوجیہر نے اسے غداری کا بہانہ اور ہتک آمیز رنگ رلیاں سمجھا اور باوجود اپیس کے پجاریوں کی عرض معروض کے نہ مانا اور اس بیل کو خود اپنے خنجر سے ہلاک کر دیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد سے کیمبوجیہر پر ایسا مغلوب الغضبی کا جذبہ سوار ہوا کہ اس نے مصری تو مصری ایرانیوں پر سخت ظلم توڑے اور خود اپنے سگے بھائی کو جسے یونانیوں نے سمردیس اور بعض دوسرے مورخوں نے اور ناموں سے یاد کیا ہے، اور جو شمالی علاقہ یعنی اناطولیہ کا خشترپا یا نائب السلطنۃ تھا، خفیہ طور پر قتل کرا دیا۔ مگر اس کے بعد وہ خود بھی بستر مرگ پر جا پہنچا اور مرتے وقت اس نے یہ اقبال کیا کہ میں نے بھائی کو قتل کرا دیا تھا۔ مگر اس تخت ایران پر تم کسی اکیمنی ہی کو بٹھانا۔ مگر ایک میدی سردار نے سازش کر کے اپنے بھائی کو جس کی سمردیس سے شکل مشابہ تھی اصل سمردیس مشہور کر کے میدیہ میں تخت نشین کر دیا۔ مگر اتفاق سے کیمبوجیہر نے اس جعلی سمردیس کے کسی جرم میں کان کٹوا دیئے تھے اس لیے وہ محل سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ مختصر یہ کہ سات مہینے کے بعد یہ راز فاش ہو گیا۔ اور فاش بھی ایک ایرانی بیوی کے ذریعے سے ہوا کہ اس نے اپنے باپ کے کہنے سے خلوت میں سوتے ہوئے اس کے کان ٹٹول کر دیکھے اور نہ پائے تو باپ سے کہہ دیا۔ اس شخص نے فوراً پانچ اور ایرانی سرداروں

کو جمع کیا اور یہ راز افشا کیا۔ ان پانچ میں دو اور کا اضافہ ہوا۔ اور ساتواں شخص دارا تھا۔ جس کا باپ پارس کا خشترپا تھا اور جو کیمنی خاندان سے تھا۔ دارا خود بڑا دور اندیش اور دلاور جوانمرد تھا اور مصر کے معرکے میں کیمبوجیہ کے ہمرکاب تھا۔ خیر جعلی سمرویس کو ان سات سرداروں نے قتل کرا دیا۔ اور بعد ازاں جانشینی کا سوال پیدا ہوا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ ایک خاص مقام اور ایک خاص وقت پر جس کا ان ساتوں میں سے گھوڑا ہنہنائے وہ تو تخت نشین ہو اور باقی سب اس کے مشیر کار اور معتمد قرار پائیں۔ اتفاق حسنہ کہ دارا کے سائیس نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ ٹھیک متعینہ وقت اور مقام پر دارا کا گھوڑا پہلے ہنہنایا اور دارا سریر آرائے ایران ہوا۔ دارا کو ابتدا میں کچھ دقتیں پیش آئیں مگر پانچ چھ برس میں اس نے سلطنت کا پورا استحکام کر دیا اور سلطنت کو اتنا بڑھایا کہ کیرس اعظم اور کیمبوجیہ کے وقت میں بھی یہ استحکام اور وسعت نہ تھی۔ دارائے اعظم بڑا دانشمند، بڑا دلاور، عالی حوصلہ اور دور اندیش منتظم تھا۔ اس کی سدیہ کی مہم کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ باختر، صغد، سیستاں، زابلستاں، مازندراں، سندھ اور ہند (وہ علاقہ جو اب صوبہ سرحد کہلاتا ہے) مصر، فلسطین، عراق عجم، اناطولیہ اور یونانی سواحل نیز موجودہ رومانیہ، بلغاریہ، تھسلی، مقدونیہ اور یونان کا پورا شمالی علاقہ سب اس کے زیر نگیں تھے۔ کیا یہ آج گمان بھی گزرتا ہے کہ ایک مشرقی مملکت کی وسعت کبھی اتنی بھی ممکن تھی!

اس اعتبار سے اس میں مصر اور باختر تک کا ذکر ہے۔ چونکہ مورخوں نے ہندوستان کے سورماؤں کا بھی ذکر لکھا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ بعض نام جو انیسکلس نے گنوائے ہیں ان میں کچھ ہندوستانی اور پٹھانی (پختونی) نام بھی

ہونے چاہئیں۔ مگر یونانی شکل وصورت میں نام اس طرح چھپ گئے ہیں یا مسخ ہو گئے ہیں کہ ان کا پہچاننا دشوار ہے۔ مگر ایک یا دو نام جن پر گمان گزر سکتا ہے انھیں ترجمہ میں اس طرح لکھ دیا ہے کہ خطوط وحدانی میں آجاتے ہیں۔ یقینی طور پر ان کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

مصر قدیم کی تاریخ کا حال ذرا مختلف ہے۔ وہاں کا حال اب قریب قریب پچھلے چوبیس ہزار برس کا تو مل چکا ہے بلکہ بعض محققین کے نزدیک ستائیس اٹھائیس ہزار برس تک کا "بج" اور دیگر مصری محققین نے مصر قدیم کی تاریخیں مرتب کی ہیں اور فرانسیسی، جرمن، انگریز اور امریکی محققین اور عالموں نے قدیم مصر کی دنیا کے متعلق پچاسوں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور وہاں کی تاریخ، مذہب، معاشرت، فنون لطیفہ، صناعی، فن عمارت وغیرہ پر مبسوط کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ مصر کی تاریخ اور حالات پڑھنے اور ان کے آثار الصنادید کی تصاویر دیکھنے سے جن پر نقاشی اور سنگتراشی کے عدیم المثال نمونے، زندگی کے ہر شعبے کی تصاویر اس کثرت سے ملتی ہیں اور پھر فراعنہ کے مقبروں میں سے اس کثرت سے چار پانچ بلکہ چھ چھ ہزار برس پرانے مصبر (تصبیر شدہ) مُردے قریب قریب بجنسہ نکلتے ہیں اور ان کے زمانوں کا ساز و سامان ملتا ہے کہ گویا ہو بہو اس وقت کا پورا نقشہ زندگی کا سامنے آجاتا ہے اور اب تو ان کے ہزاروں برس پرانے خط مصور کو بھی پڑھنے والوں کی تعداد کثرت سے پیدا ہو چکی ہے اور ان کے قصّے کہانیوں، اور ادبیات کا بھی خاصہ مواد فراہم ہو چکا ہے۔ ان چیزوں پر سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر قدیم انسانی تہذیب و تمدّن اور دینی و دنیوی ترقی کا وہ ملجا و ماوا رہ چکا ہے کہ بعد کی تمام تہذیب اور ترقی (ماسوائے پچھلی تین چار صدی کی چند اہم ایجادات اور دریافت کے)

مصر قدیم کی اولاد ہے۔ مغربی تہذیب تو قریب قریب دو تہائی سے زیادہ اسی سے ماخوذ ہے اور مشرقی تہذیب و تمدن تو تین چوتھائی سے زیادہ اس سے مشابہ ہے (سوائے چین کے جس کا دور خود قدیم ہے) روحانی اور دینی معاملات میں بھی اب معلوم ہو رہا ہے کہ مصر نے جو بلندیاں حاصل کی تھیں وہ اتنی بلند رہ چکی ہیں کہ انسانی تخیل ابھی تک ان سے آگے نہیں جاسکا۔ اگر یہ مبالغہ معلوم ہو تو طالب حقیقت نظریں مصر کے معلوم شدہ حالات کا مطالعہ کریں۔

مسیح سے ایک ہزار برس پہلے تک کہ جب بابل، کلدان، نینوا اور اشور اپنے عروج پر آچکے تھے یا آ رہے تھے، مصریوں کی نگاہ میں طفل شیر خوار تھے اور باقی دنیا تو قطعی غیر مہذب اور غیر متمدن شمار ہوتی تھی۔

مگر جس دور کا ذکر ہمیں یہاں مقصود ہے، وہ مصر کے زوال اور ادبار کا زمانہ ہے۔ کیروس اعظم ایرانی کے عروج کے وقت تک مصر کا زوال آخری سیڑھی تک پہنچ گیا تھا اور مصر کیا بابل، کلدان، نینوا اور اشور کا سورج بھی غروب ہو چکا تھا۔ یونان کا ستارہ چمکنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور ادھر ہندوستان کا بھی دوسرا یعنی بدھ مت اور بدھ تہذیب کا دور بھی شروع ہونے کی تیاریوں میں تھا۔ کیروس اعظم نے مصر پر فوج کشی کا اہتمام کیا تھا مگر موت نے مہلت نہ دی۔ مگر ادھر کیروس کا انتقال ہوا اور ادھر مصر میں احمیس جسے یونانیوں نے اماسیس لکھا ہے راحل بحر عدم ہوا۔ احمیس فراعنہ مصر میں گویا زمانۂ زوال کا آخری فرعون تھا جو یہ دیکھتے ہوئے جاں بحق ہوا کہ مصر کا روز روشن آخر ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس کے جانشین نے مصر کی عظمت کو ایرانی شمشیر کے گھاٹ اُترتے دیکھا اور خود بھی کیمبوچہر ابن کیروس اعظم کے جلادوں

کے تبر خونخوار کی نذر ہوا۔

تاریخ ملل میں سب سے بڑا سبق عبرت کا ہے۔ یہی وہ فراعنہ تھے جن کے بزرگوں نے چوبیس ہزار برس تک متمدن روے زمین پر خدائی کی۔ جن کی خدائی کا دعوی نمرود اور شدّاد سے بھی قدیم تھا جنھوں نے صرف اپنی زندگی کے ہی کارناموں کو نہیں بلکہ اپنے بیجان جسموں کو بھی زمانے کے عالمگیر چنگل سے محفوظ کرنے کی حیرت انگیز کوشش کی تھی۔ آج ہزارہا برس کے بعد ہمیں ان کے چہرے مہرے کا صاف اندازہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو سرمدیت کی سرحدوں سے جا ملایا تھا اور سمجھتے تھے کہ سیلاب اجل ان کی غیر فانی خواہشوں اور خوابوں کی کشتی کو اپنے بھنوروں میں نہیں کھینچ سکے گا۔ اس ورطہ سے کون بچ کے نکل سکتا ہے۔ مگر ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کے خوابوں کی پرچھائیاں ان کی خواہشوں کے عکس ہزارہا برس کے بعد بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور تہذیب کے وہ بیج جو انھوں نے بوئے تھے بار بار انسان کی خواہش کی زمین میں اُگتے اور پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ وہ رع یا رح اور وہ آمین یا آمن جو ان کے خیال میں آفتاب عالمتاب اور شمس الشموس کائنات کی روح تھی اور جس کا وہ خود کو مظہر سمجھتے تھے۔ جس طرح ان سے پہلے درخشاں تھا آج بھی ہے اور حیاتِ نوع انسانی کے قیام تک رہے گا۔

اجسام مستعار ہیں اور نہ قائم رہے نہ قائم رہیں گے۔ مگر وہ روح جو اجسام میں سورج کی کرن کی طرح آتی ہے، عارضی مدت یعنی جسمانی دن کا وقت پورا کرکے جسم کو عدم کی رات کے حوالے کرکے خود کہیں اور جا چمکتی ہے۔ فراعنہ یا ان کے دینی ہادیوں نے مذہب اور معاشرت کا جو سانچہ تیار کیا تھا وہ ضرور اجسام فانی کی طرح لٹ گیا مگر اس کی روح ضائع نہیں ہوئی۔ آج وہ اور

اجسام میں حلول کرچکی ہے اور اس کا دائمی سفر جاری ہے۔ مختلف اوقات میں مصری ادیان مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئے مگر ان کی تہ میں وہی بنیادی عقیدہ کام کر رہا تھا کہ انسان قیوم و قادر مطلق خالق و رب الاعلیٰ کی منشائے ابدی کا محتاج ہے اور خالق کا ظاہری مظہر شمس کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ گو وہ ہمہ اوست تک پہنچ لیے تھے مگر عام فہم مظاہر قدرت کو سامنے رکھ کر مختلف صورتوں اور مختلف شکلوں میں عبادت کرتے تھے۔ عام سمجھ کے مطابق انھوں نے اصنام تیار کیے تھے ان کے منادر بنائے تھے اور عام تسکین قلب کے لیے مذہبی ارکان کا سانچہ کھڑا کیا تھا۔ ان سب میں وہ ادیان جنھیں ہزارہا برس فروغ رہا رع یا رح، آمن اور پھر رعمٰن یا رحمٰن کی عبادت پر مبنی تھے۔ یہ مرکزی آفتاب تھا اور باقی سب چھوٹے بڑے ستارے اور سیارے۔ اور اس آفتاب پرستی کا دور زمانے میں ہزارہا برس رہا ہے اور مشرقی ممالک میں کوئی ایسا ملک اور کوئی ایسی قدیم قوم نہیں جو اس عقیدے سے بچ کر نکلی ہو۔

چنانچہ ایران بھی اس دور سے آشنا ہوا اور میدی مجوس یا مگوس (مگوش) آفتاب پرست تھے اور صابئین میں ستارہ پرستی بھی رائج تھی۔ بعدازاں آتش پرستی کا دور رہا اور اس دور میں سب سے مشہور پیمبر زردشت ہوئے۔ چنانچہ ایرانی خصوصاً دری اور پہلوی ایرانی آتش پرست تھے۔ دارا اور اردشیر کا زمانہ آتش پرستی کا دور تھا۔ اور یہ قیاس چنداں بیجا نہیں کہ مجوسی اہل میدیہ اور زندیقی یا آتش پرست اہل ایران میں حقیقی رقابت اور اختلاف سیاسی تھا۔ نہ اس درجہ نسلی اور نہ اس درجہ مذہبی۔ مگر سیاسیات ہمیشہ دینی اختلافات اور عقیدے کی رقابت سے فائدہ اُٹھاتے چلے آئے ہیں اور جزوی اختلافات عقائد کو بنیادی دینی اختلافات کا جامہ پہنا کر اپنا کام نکالتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ یہی حال اس قدیم زمانے کا تھا کہ اگرچہ

مصری، بابلی، کلدانی، میدی، ایرانی اور یونانی کل اصنام پرست تھے اور ان کے اعتقادات کا آج مقابلہ کیجیے تو حیرت ہوتی ہے کہ کتنے ایک دوسرے کے قریب تھے۔ مگر سیاسی ضرورتوں نے انھیں ایک دوسرے کا رقیب بلکہ دشمن جانی بنا دیا تھا اور سیاسی زعماء نے اس حربے کو بڑی کامیابی سے استعمال کیا اور ہر ایک نے دین اور مذہب کے نام پر دوسروں کی غارتگری ضروری اور جائز قرار دی۔ اور موجودہ زمانہ تو ہمیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ اور تو اور خود موحد ایک دوسرے کو ملحد قرار دے دینے میں تامّل نہیں کرتے۔ اور مذہب غریب کے نام اور خدائے ذوالجلال والاکرام کے نام پر خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ روحانیت کے مدعی بظاہر خدا کے نام پر مگر حقیقت میں خودی کی خاطر ایک دوسرے کا سر قلم کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جس زمانے کا یہ قصّہ ہے ایرانیوں میں زندیقی عقائد اور آتش پرستی کا دور تھا اور اسی عقائد کی بنیاد پر ایرانی کیمنی خاندان نے مگوسی یا مجوسی عقائد کے میدیوں کو تخت و تاج سے محروم کیا اور پھر مصریوں کو بھی۔ مگر لطف یہ ہے کہ ہر قوم نے قریب قریب ہمیشہ اپنا اقتدار اور تسلط قائم کر لینے کے بعد رعایا کو اپنے مذاہب اور عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پورا موقعہ دیا اور یہ مصلحت اندیشی کا تقاضا تھا۔

وہی قادر مطلق اور خالق اکبر تھا جو ایرانیوں میں نورٌ علیٰ نور یا "حورہ" یا اہورہ "آہورمزدہ" تھا، اور مصریوں میں رح، رحمٰن اور اہورا تھا، یونانیوں میں زیوس وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا تھا اور اعراب جاہلیت میں شمس تھا۔ گو ابراہیمی نے اس کے اصنامی پہلو کو شرک قرار دے کر الوہیت کا ایک خاص خیال مکمل کیا تھا جس نے پھلتے پھلتے بالآخر وہ صورت اختیار کی جس میں ہر قسم کی

اصنام پرستی کفر قرار دیدی گئی۔ مگر خود یہود اور اسرائیلیوں نے بھی وقتاً فوقتاً اصنام پرستی پر عود کیا اور مصر و بابل کے عقائد کو اختیار کیا۔ خیر یہ بحث تو بہت وسیع ہے اور معاملہ بڑا طولانی ہے۔ یہاں تو صرف اتنا بیان کرنا تھا کہ ایرانی کیمنیوں کے خاندان کے دور دورہ میں جس سے یہاں واسطہ ہے زنادقہ کا عروج تھا۔ یعنی اس مذہب کا جس کی کتاب مقدس "زند" اور پرستش کا مرکز "آتش" تھی۔

اتنا بیان کر دینا اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ باوجود زوال اور محکومیت کے مصری اس دور میں بھی جہاز رانی میں فینیقیوں اور قبرصیوں کے ہمسر اور اس دنیا کے بحری ماہر تھے اور ان یونانی اقوام سے جو اپنی جغرافیائی حالت اور قومی ضروریات کی وجہ سے جہاز رانی اور کشتی بانی میں طاق اور ماہر مانے جاتے تھے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ ان کا پلّہ بلند سمجھا جاتا تھا۔

اردشیر کے بیڑے میں مصری، فینیقی اور قبرصی جہاز رانوں کا ہجوم تھا نیز آئیونی یا مشرقی یونانیوں کی ایک بڑی تعداد تھی اور اردشیر کے خیال میں بحری ہزیمت کی یہی وجہ تھی کہ ان غیر ایرانی محکوم اقوام کو ایران کے اقتدار کی ترقی میں اتنی دلچسپی تھی کہ جتنی مجبور محکوموں کو ہو سکتی ہے اور وہ دل سے نہیں لڑے۔

اوراق ماسبق میں جو تاریخی جملۂ معترضہ آگیا۔ گو معذرت کا متقاضی ہے مگر ہماری نظر میں وہ اس لیے ضروری تھا کہ اس زمانے کی دنیا کا جب "پارسی" لکھا گیا ایک ایسا خاکہ سامنے آجائے جو نہ صرف "پارسی" کی تلمیحات کے سمجھنے میں مدد دے بلکہ اُن صحیح واقعات کا بھی نقشہ پیش کر دے جن کی بنیادوں پر "پارسی" کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ اس نقشہ کے پیش کرنے میں اس دور کے

تاریخ و تمدن، ادیان، عقائد اور دلچسپ روایات و حکایات کا آمد سخن میں تذکرہ آجانا لازمی تھا مگر اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ خود "پارسی" پر ایک نظر ڈال لی جائے اور اندازہ کیا جائے کہ یونانی تمدن کے قدیم دور کی کیا تصویر تھی۔ چنانچہ اب ہم وہ تصویر پیش کرتے ہیں۔

پارسی پر اڑتی ہوئی نظر

یونانی تماشا گاہ

یونانی تماشا گاہ پہلے تو کرسی تختوں کا ہوتا تھا اور تماشائیوں کو عام اجازت تھی کہ جو چاہے بغیر کچھ ادا کیے جائے اور دیکھے۔ ہزاروں آدمی پہنچتے تھے اور تماشے دیکھتے تھے۔ مگر ایسکلس کے زمانے میں ایک مرتبہ تماشا گاہ ہجوم کا بوجھ نہ سہار سکی اور بہت لوگوں کو چوٹیں پھینٹیں آئیں۔ اس کے بعد پتھر چونے کی تماشا گاہیں بننے لگیں۔ عموماً تماشا گاہ نعل نما یعنی ایمفی تھیٹر ہوتا تھا، جس میں تماشائی سیڑھیوں پر نعل کے دور میں بیٹھتے تھے اور سازندے اور اداکاران کے روبرو ہوتے تھے۔

اثینیہ کے تھیٹر میں تیس تیس ہزار آدمی ایک وقت میں تماشہ دیکھتے تھے۔ آگے چل کر جب ہجوم بہت ہونے لگا تو فیرقلیس کے زمانے میں تماشہ گاہ میں تین درجوں کی نشستیں کر دی گئیں۔ درجہ اول میں بیٹھنے والے تین اوبول یا تین روپے سمجھ لیجیے، دیتے تھے اور درجہ دوم والے اس کا آدھا اور غالباً درجہ سوم میں یا تو ایک اوبول دیتے تھے یا شاید بعض موقعوں پر مفت تماشہ دیکھتے تھے۔ بہرصورت بیس تیس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ لوگ بڑے زندہ دل تھے اور تماشوں کے بڑے شائق۔ گھر سے کھانا شراب اور بستر بچھونا تک لے کر آتے تھے اور بیچ میں آرام بھی کر لیتے تھے۔ بڑا شور و شغب کرتے تھے۔ پھبتیاں کستے تھے۔ فقرہ بازی

بازی کرتے تھے۔ خود گانے لگتے تھے۔ گانے والے طائفوں کے گیتوں میں شریک ہو جاتے تھے۔ غرضکہ جو تفریح کی ہو حق ممکن ہو سکتی تھی وہ سب بڑی زندہ دلی سے کرتے تھے۔ انگریزوں کی طرح گم سم نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کی زندہ دلی پورے طور پر مشرقی قسم کی زندہ دلی تھی جو اب بد قسمتی سے خود ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں انگریزی سنجیدگی کی غلط اور بے معنی نقالی سے بدل کر مردہ دلی کا مرقع بن گئی ہے۔ یونانی زیتون، مچھلی اور ہر قسم کے گوشت ترکاری اور خاص طور پر لہسن پیاز کے اچاروں کے بڑے شوقین تھے۔ اور مے نوشی تو ان کے خمیر میں تھی۔ شراب کے مشکیزے اور کھانے کا سامان لیا اور تماشہ گاہ میں جا کے ڈٹ گئے۔ تیس ہزار کے مجمع کی بیچاسوں ضرورتیں ہیں جب تک تماشا نہ شروع ہو انھیں تفریح چاہیے۔ وہیں بازیگر، ناچنے کودنے والے، ٹھرّی لگانے والے، خوانچہ والے سب پہونچ جاتے تھے اور جسے اُردو میں چہل پہل اور دھوم مچانا کہتے ہیں وہ صحیح معنوں میں تماشہ گاہ کی روح تھی۔ نقّال اور اداکار ایک طرف اور بیچارے تمثیل نگار اور شاعر اور ان کے مربّی جو تماشے کی تیاری کے اور اداکاروں، منظروں اور سازندوں کے اخراجات برداشت کرتے تھے دوسری طرف کانپا کرتے تھے کہ دیکھیے تماشائی خوش ہوتے ہیں یا نہیں ورنہ سب کیا کرایا ذرا سی دیر کی پھبتی بازی میں خاک میں مل جائے گا۔ اسی لیے عمدہ گانوں اور موسیقی کا پورا انتظام ہوتا ہوتا تھا۔ کوئی تماشا بغیر سازندوں اور گانوں کی مدد کے چل نہیں سکتا تھا۔ اداکار زرق برق اور چمکیلے یا نظر کش اور دلکش لباس پہنتے تھے اور بناؤٹی چہرے لگا کر آتے تھے۔ آج کل کی طرح پردوں کا انتظام نہیں تھا بلکہ صرف ایک پشت پر یا کہیے کہ تماشائیوں کے سامنے ایک پردہ یا ایک منظر ہوتا تھا بعد میں

بکھوائیاں بننے لگیں تھیں اور جب اس سے آگے ترقی کی تو ایک ایسا پردہ جو کھٹے میں جڑا ہوا لگانے لگے جسے حسب ضرورت پہیّوں پر ڈھکیل کے لا اور لے جا سکیں۔ سٹیج یا چبوترے کے آگے کے چکّر میں سازندے بیٹھتے تھے اور اداکاروں کا طائفہ دائیں بائیں سے سازندوں کے برابر سے آکر چبوترے پر پہنچتا تھا اور خاص اداکار حسب ضرورت پردے کے پیچھے ایک دروازے سے آتے اور جاتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شاید اردشیر کے حملے کے وقت اثینیہ کی تماشا گاہ جلا کر خاک کر دی گئی تھی اور ایسکلس نے غالباً نئی تماشا گاہ میں پارسی کو پیش کیا ہوگا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ پارسی ۴۷۲ قبل مسیح میں اردشیر کے حملے کے آٹھ برس بعد پیش کیا گیا۔

ہوسکتا ہے کہ ایسکلس نے نئے تماشا گاہ کے افتتاح کے موقعے پر سالامیس کے معرکے اور اردشیر کی پسپائی کے مضمون کو برمحل سمجھ کر پیش کیا ہو۔ تاکہ وہی آنکھیں جنھوں نے اثینیہ کے محلات، منادر اور تماشا گاہوں کو منہدم ہوتے اور جلتے دیکھا تھا اور وہی آنکھیں جو تھرموپلی اور ماراثون، اثینیہ اور سالامیس کے مقتولوں کو روئیں تھیں، نو تعمیر تماشا گاہ میں ایرانی پسپائی، ہزیمت اور خانہ خرابی کی داستان اور قوت ایران کے زوال کا جرأت افزا اور حوصلہ آفریں نظارہ بھی دیکھ لیں اور وہ کان جنھوں نے اثینیوی یتیموں اور بیواؤں کی آہ و بکا اور یونانی ماؤں کی نوحہ وزاری سُنی تھی ایران کی شکست اور سوسوی قصر و ایوان میں نوحہ گری اور ماتم کا نالہ وفغاں بھی سُن لیں۔ ایسے موقعہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کون سا افسانہ ہوسکتا تھا جو اثینیوی آبادی کے زخمی دلوں کا مرہم بھی ہو اور پرجوش قومی فخاری کا شادیانہ بھی۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح لوگ اس تمثیل کو دیکھنے اور ایسکلس کی قلم کے ایرانی ملکہ اور ایرانی سر برآوردگان کے نوحے اور مرثیے سننے اور اپنے دلاوروں کے کارناموں کی مدح سرائی اور قصیدے سے دل تر و تازہ کرنے جوق در جوق ٹوٹے ہوں گے۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چھوٹے موٹے شاعروں نے بھی اس معرکے پر یونانی مذاق کی ہزلیات اس غرض سے لکھی ہوں گی کہ تماشا گاہ سے پہلے لوگوں کا دل بہلائیں اور نہ معلوم کن کن خیالات کا اظہار کیا ہوگا۔ قلم اور خیال اس تمام نظّارے اور اس تمام مجلس کا ایک نقشہ کھینچ سکتے ہیں اور دیدۂ تصوّر اس تماشے کا پورا تماشا دیکھ سکتا ہے۔

یہ بھی خیال میں آسکتا ہے اور بہت زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ اثینیہ کے عمائدین جو جمہور کے قائد اور خطیب تھے، عالم فاضل، فلسفی، امرا روسا، مرد عورت سب ہی اس تماشے کو دیکھنے گئے ہوں گے۔ غالباً سقراط اور افلاطون بھی ہوں گے، سقراط کا جواں سال حسین محبوب القیائیدیس بھی ہوگا اور نہ معلوم اور کتنے مشاہیرِ آفاق موجود ہوں گے۔ مارثون اور سالامیس کے معرکہ آرا بھی ہوں گے اور یونان کے واضعانِ قوانین اور جمہوری حکومت کے کارپرداز بھی۔ پھر اس زمانے کے صنّاع اور اثینیوی حرفت پیشہ آبادی بھی کہ جو اس زمانے کی روحِ رواں تھی۔

اداکاروں کے طائفے کے داخل ہونے سے پہلے کافی غُل غپاڑہ رہا ہوگا مداریوں اور شعبدہ بازوں، دف و چنگ لیے مطربوں کے طائفے، نقالوں اور پھل پھول بیچنے والوں کی ٹکڑیاں لوگوں کے دل بہلاتی اور خرید و فروخت کا بازار گرم کرتی پھرتی ہوں گی۔

اتنے ہی میں سازندوں نے ساز چھیڑا ہوگا۔ تماشا طائفے کے داخلے پر سازندوں کے نغمے سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے غل اور شور کم ہوا ہوگا۔ ادھر سے اداکار ایرانی لباس پہنے سوسوی وزرا اور امرا کا بھیس بھرے سروں پر دستار، بدن پر جامے اور قبا، سفید ریش، ہاتھوں میں نقرئی اور طلائی عصے پاؤں میں زرکار ایرانی زیر پائیاں جلوس بنا کے داخل ہوئے ہوں گے۔ ایسکلس پردے کے پیچھے مع اپنے احبا کے کھڑا ہوگا اور اس کا دل دھک کر رہا ہوگا کہ دیکھیے پردۂ جمہوریت سے کیا جذبہ نمودار ہوتا ہے۔ لوگ اس کے تماشے کے مشتاق اور وہ لوگوں کے دلوں کی آواز کا مشتاق ہوگا۔

طائفے کے داخل ہوتے ہی یقیناً واہ واہ کا نعرہ بلند ہوا ہوگا، تالیاں بجی ہوں گی اور پچھلی نشستوں پر سے سیٹیوں، پھبتیوں اور فقرے بازی کی آوازیں بلند ہوئی ہوں گی۔ غرضیکہ زندہ دل تماشائیوں کے ایک مجمع کو جو کچھ کرنا چاہیے سب ہوا ہوگا۔ یونانی تماشائی طائفے کے گیتوں میں خود شریک ہو جاتے تھے اور پورے جوش سے حصّہ لیتے تھے اور تماشوں کی کامیابی کا بڑا دارومدار اچھی آوازوں اور دلپذیر گانوں پر بھی تھا۔

تماشا شروع ہو جاتا ہے۔ سر طائفہ بولنا شروع کرتا ہے کہ ہم اس کاخِ زریں اور اقلیم ایران کے پاسبان ہیں۔ اور ہمیں ایشیا کی حفاظت اور سلطنت کی کارپردازی اور زمامِ حکومت سپرد ہوئی تھی تاکہ شہنشاہ اور فوج ظفر موج کی واپسی تک ہم اپنے فرائض انجام دیں۔

پھر وہ کہتا ہے کہ جب سے اعلیٰ حضرت اور عسکر بیکراں نے مہم یونان کا رخ کیا کوئی خیر خبر نہیں آئی اور اس وجہ سے ہم پریشان ہیں۔ پھر وہ لشکر کی تیاری اور روانگی کا نقشہ کھینچتا ہے اور دکھاتا ہے کہ شہریار کے ہمعنان

ایشیا کے کونے کونے گوشے گوشے سے پیادہ و سوار بحری و بری لشکر گیا ہے۔ سلاطین، امرا، عمائدین، سپہدار اور سپہ سالار، غرضکہ مشاہیر کے نام گنواتا ہے۔ اور سوسہ اور ایشیا کے گھروں کا حال بیان کرتا ہے کہ مائیں اپنے لالوں اور بیویاں اپنے شوہروں کی خیر منا رہی ہیں، گھر خالی ہیں، سیجیں سونی پڑی ہیں، انتظار کی کٹھن گھڑیاں کاٹنی مشکل ہو گئی ہیں۔

اب یہ بیان کافی تھا اس زمانے کے سننے والے اس سے زیادہ لمبی داستان اور تحت اللفظ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور ضرورت تھی کہ اب ان کی توجہ گانے سے قائم رکھی جائے۔ چنانچہ طائفے کے دو شخص آمنے سامنے جو کچھ کہنا ہے گا کر سوال و جواب کے طور پر سناتے ہیں۔ یہ گانے یوں تو مناجات طائفہ کہلاتے تھے یا اور اسی قسم کے نغمہ کے نام سے پیش ہوتے تھے۔ وزن ترنم اور خاص تال سُر کے لحاظ سے لکھے جاتے تھے اور اس میں یونانی شاعری کی بڑی باریکیاں ہوتی تھیں مضمون خواہ معمولی رہ جائے مگر خاص تال اور سُر میں فرق نہ آئے اور اس وجہ سے ان گیتوں کا ترجمہ بڑی حد تک اصل کے اثر کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ یہ سوال و جواب دیر تک جاری رہتا ہے اور اس میں نہ صرف گذشتہ بلکہ آنے والے واقعات کا ذکر اور حوالہ آجاتا ہے اور یہیں ایکلس اپنے اخلاقی پند و نصائح، قضا و قدر کے ناگزیر احکام اور دینی عقائد، تکبر اور حرص کی پاداش، مختلف قسم کے اخلاقی مقولے اور تعلیم تلقین شروع کر دیتا ہے، جو طائفہ اور اداکاروں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔

اتنے ہی میں ملکہ آتسہ، اردشیر کی ماں شاہانہ کر و فر سے ارابۂ ایرانی میں سوار آتی ہے (یونانیوں کے خیال میں یا ممکن ہے اس زمانے میں ملکہ بھی ایوان خاص میں ارابہ (رتھ) میں سوار ہو کے آتی تھی) غالباً اس موقع پر ملکہ کی جلو

میں خواصیں اور خواجہ سرا وغیرہ ہوں گے اور تماشائیوں نے سیٹیاں بجائی ہوں گی اور اس زمانے کے جمہوری مذاق کے لحاظ سے اس شاہی شان و شوکت پر فقرے کسے ہوں گے ۔ ارسطوفانیس نے اس واقعہ کے چالیس پچاس سال بعد اپنی مزاحیہ نقلیں پیش کرنی شروع کیں تو ان میں جہاں موقع مل گیا ہے ایرانیوں کا بھی مذاق اُڑایا ہے۔ اور ہزل گوئی تو درجہ عریاں تک ہے کہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی مذاق اس کوچے میں کہاں تھا۔ ہندوستان میں ہولی کے موقع پر جو کایستھ صاحبان کے محاورے میں "کفر کچہری" کبھی ہوا کرتی تھی وہ بھی کیا مقابلہ کرے گی۔ یا شاید کرے تو وہی مقابلہ کرے اور یہ سب بے تکلف زندہ دلی کی باتیں ہیں اور یونان میں اس کیفیت اور ذوقِ عریانی کو بڑا دخل رہا ہے۔ جس کے بعض قبیح پہلو تاریک بھی ہیں جس کا خود سقراط اور افلاطون کے مقالوں سے اندازہ ہوتا ہے ۔

ملکہ کے تشریف لانے پر طائفہ سجدہ کورنش بجا لایا۔

ملکہ نے ارشاد فرمایا کہ جس دن سے میرا دلبند عازم مہم یونان ہوا ، میں طرح طرح کے خوابِ پریشاں دیکھ رہی ہوں اور بدشگونیاں ظہور میں آرہی ہیں۔ میں آپ بزرگوں سے صلاح و مشورہ کرنے آئی ہوں۔ کل ہی میں نے ایک خواب دیکھا جس نے مجھے پریشان اور خوفزدہ کر دیا اور طرح طرح کے پراگندہ خیال ، وسوسہ اور وہم میرے دل میں آرہے ہیں۔ پھر ملکہ خواب بیان کرتی ہے ۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس زمانے میں اور اس سے پہلے سے خوابوں کا قصہ اور ان کی تعبیر کا معاملہ ایک فن اور علم بن گیا تھا اور بدخوابوں کے خراب اثرات کے ازالے اور دفیعے کے لیے صدقے ، قربانیاں ، نیازیں اور نذریں

تجریز ہوا کرتی تھیں۔ ادبی خوابوں میں قدیم زمانے کا فرعون کا خواب اور پیمبر یوسفؑ کی تعبیر۔ ضحاک کا خواب، ابوالشاذر کا خواب اور پیمبر دانیال کی تعبیر، اور اسی خاندان میں افراسیاب کا خواب (جو استیاگ کے خواب سے بالکل مشابہ ہے) اور یونانیوں میں متعدد خواب مشہور ہیں (خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ یونانیوں نے افراسیاب تورانی کو استیاگیز یعنی استیاگ بنا دیا ہو اور کیروس حقیقت میں کیخسرو ہو۔ استیاگ کی بیٹی جس سے کیروس پیدا ہوا یونانی مندانی یا مندنی لکھتے ہیں اور باپ کا نام کیمبسیز اکیمنی لکھتے ہیں۔ کیخسرو کے باپ کا نام شاہنامے میں سیاوش پسر کیکاؤس ہے جو شاہ بلغار کی بیٹی سے ہوا تھا اور ماں کا نام فرنگیش لکھا ہے اور اس اعتبار سے بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ مگر باقی افراسیاب اور استیاگ کے خوابوں کا قصّہ حرف بہ حرف وہی ہے۔

مگر ایک نام میدیہ کے بادشاہوں میں ۶۳۵ قبل مسیح سے پہلے کائی اکیسریز یا کیاسریز کا ہے جو استیاگ سے کوئی چالیس پچاس برس پہلے ہوا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ کیکاؤس یا کیخسرو ہو۔ فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ شاہنامے کے ناموں سے مطابقت ہو جائے تو واقعات مختلف ہو جاتے ہیں۔ مگر قرین قیاس اگر کوئی نام ہو سکتا ہے تو وہ کیخسرو تو کائرس یا کیروس کی جگہ اور افراسیاب استیاگ کی جگہ۔

مگر پھر کیخسرو کا بیٹا شاہنامے میں کیمبسیز کیا ہو گا؟ اور دارا کہاں جائے گا۔ کیا دارائے گشتاسب کو بنایا جائے اور اگر دارا کا نام گشتاسب سمجھیں تو زرکسیز کہاں گیا اور اس کے جانشینوں میں کائرس اور دارا بھی اور ہوئے جو شاہنامے میں نہیں۔)

بزرگان ایران یعنی اداکاروں کے طائفے نے خواب سُنا اور عرض

کی کہ آپ ارض مقدس (یعنی کرۂ ارض کی دیوی جسے مصری بھی مانتے تھے) اور خداوند خورشید، یا اہورمز کی بارگاہ میں الحاح وسماجت کیجیے اور دارائے اعظم کی روح کی خدمت میں نیاز گزرانیے اور یہ خدایان بزرگ وبرتر ہی ہیں جو آسیب و آفات سے بچا سکتے ہیں۔

ملکہ یہ سن کے کہتی ہے کہ آپ کا مشورہ نیک ہے اور میں محل جاکر نیاز کا انتظام کرتی ہوں۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اثینیہ کہاں ہے اور وہاں کے لوگ کیسے ہیں اور آیا وہ ایرانی لشکر کے مقابلے کی تاب بھی لا سکتے ہیں یا نہیں۔

اب یہ محض ایسکلس کی شاعری ہے کہ وہ کیروس اعظم کی بیٹی دارائے اعظم کی ملکہ اور اردشیر کی ماں کو جس نے پانچ سلطنتیں دیکھیں اور جس کا قصہ اوپر بیان ہو چکا کہ خود ایک یونانی حکیم نے اسے فتح یونان کے خواب دکھائے تھے۔ اس درجہ ناواقف اور جاہل دکھاتا ہے۔ اور یہ وہی آتسہ ہے جو اس دنیا کی وسیع ترین مملکت کی نہایت بیدار مغز، اور امور خسروی کی ماہر مانی جاتی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُدھر تماشائیوں کی واقفیت کا کیا حال تھا یا ان کی خواہشات کا کیا اندازہ تھا اور ادھر خود تمثیل نگار جو اثینیہ اور اثینیوی جمہوریت کی تعریف کر کے تماشائیوں کو خوش کرنا چاہتا تھا سوائے اس کے اور کوئی معقول ذریعہ نہ سوچ سکا کہ خود ملکہ سے اس قسم کے جاہلانہ سوال کرائے اور اہل دربار سے ان کے جوابات دلوائے۔ آج کے دن مبصر اس طریقۂ اظہار کو بالکل طفلانہ قرار دے سکتے ہیں اور بجا طور پر۔ اگر اثینیہ کی جمہوریت اور اثینیہ کے حالات پر نظر ڈالنی ہی تھی تو اس کے اور بہت سے ذریعے ہو سکتے تھے۔ مگر ہم کو آج کی کسوٹی پر اس نقل کو نہ کسنا چاہیے۔ بلکہ اس زمانے کے حالات کے اعتبار سے اس کو جانچنا چاہیے۔ یہ مقصود نہیں کہ اس تمثیل کو

بالاستعاب نہیں دیکھنا چاہیے۔ مگر مناسب تحسین کو پیشِ نظر رکھنا قرینِ انصاف ہے۔

ابھی ملکہ کے سوال اور طائفے کے جواب ختم نہیں ہوئے تھے کہ یکایک ایک پیک دوڑتا ہوا آتا ہے اور اب خطاب اس سے ہو جاتا ہے۔

یہ پیامبر شکست اور شکست کے بعد اردشیر کی جان بچا کر بھاگنے اور افواج کی بربادی، شاہزادوں، سالاروں اور سپاہ کے قتل و قمع اور بیڑے کی تباہی کی خبر سنانی شروع کرتا ہے اور نام بنام مقتولین کے حالات سناتا ہے۔ ماتم بپا ہو جاتا ہے۔ مگر ملکہ باوجود انتہائی صدمے کے صبر اور سنجیدگی، تحمل اور بردباری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ اور ہماری رائے میں نقل کا یہی حصہ ہے جس میں ایسکلس نے اپنے قلم کو جمہوریت کے مذاق کے تابع نہیں کیا۔ اور یہی کیفیت آگے چل کر وہاں نظر آتی ہے جہاں دارائے اعظم کی روح کا درباریوں اور ملکہ سے مکالمہ ہوتا ہے۔ گو اس میں بھی غلط بیانیوں کو جائز رکھا گیا ہے۔ شاہی بردباری، وقار اور دبدبے کو ان دونوں موقعوں پر مناسب طور پر نمایاں کیا ہے۔ پیامبر کی تمام داستان ختم ہونے پر جو انتہائی غلط بیانی اور مبالغے سے لبریز ہے اور جس میں ایسکلس نے اثینوی تماشائیوں کو اپنے جوانمردوں کے کارنامے خوب خوب بڑھا چڑھا کے اور ایرانی پسپائی کو بالکل شکست فاش بنا کے دکھایا ہے۔ مگر تاریخی واقعہ ہم پہلے ہی اختصار سے مگر صحیح خد و خال کو ظاہر کرتے ہوئے قلمبند کر چکے ہیں۔

اس ماتم انگیز داستان کو سن کے ملکہ درباریوں سے یہ کہہ کے چلی جاتی ہے کہ میں جا کے نیاز نذر کرتی ہوں۔

یہاں بھی وہی تماشہ کی مصلحت کام کرتی ہے کہ اتنا لمبا المیہ مکالمہ سن کے

اب تماشائی تحت اللفظ سے اکتا گئے ہوں گے اور گانے بجانے کے مشتاق ہوں گے۔ چنانچہ طائفہ اپنی مناجات شروع کر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ مناجات بھی ایک نوحہ اور مرثیہ ہے اور اس میں شاعرانہ انداز ذرا زیادہ چمک کر آیا ہے۔

اس مناجات کے اختتام پر ملکہ پھر آتی ہے اور دارائے اعظم کی تربت کے سامنے نیاز و نذر کرتی ہے اور طائفہ دارا کی روح اور عالم ظلمات اور فرماں روایان عدم سے التجا کرتا ہے کہ دارا کی روح نمودار ہو۔

مقبرے کی بالائی منزل پر دارا کی روح نمودار ہوتی ہے اور شاہی رعب و ہیبت سے درباری دم بخود ہو جاتے ہیں۔ آخر دارا کہتا ہے کہ اگر آداب شاہی نے تمھارے لبوں پر مہر لگا دی ہے تو میں ملکہ سے مخاطب ہوتا ہوں۔ میں یہاں طول طویل گفتگوؤں کے لیے نہیں آیا۔ ملک عدم سے روے زمین پر دوبارہ آنا معمولی اور آسان کام نہیں۔ میرا یہاں قیام مختصر ہے جو کچھ کہنا ہے اختصار سے کہو اور جواب لو۔ پھر وہ ملکہ کو مخاطب کرتا ہے اور ملکہ نہایت ہی اختصار سے کہتی ہے کہ ایران کا اقتدار خاک میں مل گیا اور فوج تباہ ہو گئی۔ اس پر دارا بالکل لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ روحوں کو اس دنیا کے حالات سے کیا واسطہ۔ مگر باوجود اس کے دارا جس دلچسپی اور جن خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ بالکل وہی ہیں جو اس کی زندگی میں ہوتے۔ اور لاعلمی کا یہ حال ہے کہ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ خود اس نے ہی اردشیر کو تاجدار ایران مقرر کیا تھا۔ اور اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ یونان پر فوج کشی کرنے کی تیاری خود اس نے شروع کی تھی۔ درہ دانیال پر کشتیوں کا پل باندھنے کا حال سن کر بھی بہت متعجب ہوتا ہے اور اسے خود اپنا باسفورس پر اسی قسم کا

پل بند ھوانا اور سرپے کی مہم یاد نہیں رہتی وغیرہ وغیرہ مگر ظاہر ہے کہ ایسکلس کو اپنے ڈھنگ سے ان تمام معاملات کو ظاہر کرنا تھا۔ اور اس نے ملکہ اور شہنشاہ کے مکالمے میں ان واقعات کو کھینچ لیا۔

پھر اس نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اردشیر اور دارا میں زمین و آسمان کا بل ہے۔ دارا کی مدح ہے اور اردشیر کی مذمت۔ یعنی اس کے بے عقل، زود فیصلہ نااہل، ناسزا اور کوتاہ اندیش ہونے کا نقشہ ہے جو سراسر غلط ہے اور مبالغے سے چھلک رہا ہے۔

یہاں تک تو دارا بالکل لاعلم تھا پھر یکایک وہ ایک پیش گو پیمبر بن جاتا ہے۔ ملکہ سے کہتا ہے خیر جو ہوا سو ہوا اب تم محل میں جاؤ اور اپنے فرزند کے لیے ایک خلعت فاخرہ لاؤ۔ اس کا زربفت (زردوزی) کا لباس پارہ پارہ ہے اور گریبان و دامن چاک ہیں، اگرچہ "رنج کی زردوزی یہی ہے"۔ اردشیر عنقریب محل میں داخل ہونے والا ہے۔ میرا وقت پورا ہو چکا، میں جاتا ہوں۔ مگر صورتِ حال نازک ہے۔ جب اردشیر آئے تو اس سے شفقت سے پیش آنا، دلجوئی کی باتیں کرنا اور مشفقانہ پند سے کام لینا تاکہ وہ آئندہ اس قسم کی خام خیالیوں سے باز رہے اور وہ کام نہ کرے جو بارگاہِ ربانی میں ناگواری اور ناراضگی کا سبب ہوتے ہیں۔

اس سے پہلے وہ یہ ظاہر کر چکا تھا کہ فتح یونان ناممکن تھی کیونکہ علاوہ اس کے کہ وہاں کے لوگ جانباز ہیں وہاں کی سرزمین بھی ان کی طرف سے جنگ کرتی ہے اور یہ بھی ظاہر کر چکا تھا کہ جن ملحدانہ حرکات کا ایرانیوں نے ثبوت دیا اور یونان کے خدائے قہار کی پرستشگاہیں، اصنام، درگاہیں اور زیارتیں منہدم کیں اور ان میں غارتگری کی اس کا صلہ اور پاداش تباہی اور

بربادی کے سوا اور کیا ممکن ہو سکتا ہے۔

آخر میں دارا کی روح یہ کہہ کے رخصت ہوتی ہے کہ زندگی مستعار ہے اور اس روے زمین پر تم عارضی طور پر مہمان ہو۔ خوشیاں مناؤ اور خرم و شاد ہو کر بسر کرو۔ دولت و ثروت زیر زمین کام نہیں آتی۔ دارا پند و نصائح میں جہاں اور بہت سی باتیں کہتا ہے وہیں یونان کے مقدس شہر "اثینیہ" کی نسبت تنبیہ کر دیتا ہے کہ اس کے فتح کرنے کا خواب پھر نہ دیکھنا۔

اس اندازِ بیان میں اثینوی فاتحوں کی تعریف و مدح سرائی جو کچھ ہے سو ہے مگر یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ ابھی ایرانی حملے کا کھٹکا لگا ہوا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابھی ایران کا یورپ اور اثینیہ کے شمال میں بدستور اقتدار قائم تھا اور کم سے کم پورے سو برس بعد تک رہا۔ حتیٰ کہ اس سانحہ کے بعد خود ارستائیدیس جو سالامیس میں تمام یونانیوں کا نہیں مگر اثینیہ کا قائدِ اعظم ضرور تھا۔ تھوڑے ہی زمانے کے بعد جلا وطن کیا گیا اور بقیہ عمر اس نے شاہِ ایران کے وظیفے پر کاٹی۔ اسی طرح سپارطہ کے زعما کا یہ وتیرہ رہا کہ بار بار ایران کے دست نگر ہو کر آتے تھے۔ القبائیدیس کا یہی حشر ہوا کہ وہ بھی خشتریا اردفیریں کا وظیفہ خوار ہو کر جلا وطنی میں مرا۔

بیسیوں حصے اس تمثیل کے ایسے ہیں جو نہ تاریخی حیثیت سے نکتہ چینی سے بچ سکتے ہیں اور نہ فن کے اعتبار سے۔

اس کے بعد خود اردشیر پھٹے حال، بانکے دہاڑے، پوشاک لیر لیر اور صرف ایک خالی ترکش لیے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

مگر داخلے سے پہلے ان تمام بزرگانِ ایران کا مجمع دیکھ کر جھجکتا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں میں رعشہ ہو جاتا ہے کہ اب میں انھیں کیا منھ دکھاؤں

بارے اندر آتا ہے اور پھر جو کہرام اور ماتم، سینہ کوبی اور نالہ وفغاں شروع ہوتا ہے تو فلک الافلاک کا دل ہل جاتا ہے۔

طائفے والے نام بنام ایک ایک شہزادے اور ایک ایک سردار، سلطان، باجگزار اور سالار کو پوچھتے ہیں اور وہ سب کا پتہ ملک عدم بتاتا جاتا ہے اور نوحہ وسینہ کوبی کی ہدایت کرتا جاتا ہے۔ بزرگوں سے کہتا ہے ڈاڑھی اور سر کے کالاسے بال جو تمھاری بزرگی اور عزت کی علامت ہیں نوچو، جامے چاک کرو، چھاتی پیٹو، نالہ وفغاں ایسا کرو کہ عرش ہل جائے، اور خالی ترکش دکھا کے کہتا ہے کہ بس کل یہ کائنات بچی ہے، باقی سب غارت ہوگیا۔ میں بالکل بے یار و مددگار رہ گیا وغیرہ وغیرہ۔ گھر گھر، بازار بازار ماتم ہوتا ہے، غرضیکہ قومی عزاداری کا بادل کونے کونے گوشے گوشے پر گھنگور اور بھیانک گھٹا کی طرح چھا جاتا ہے۔

اس ماتم کے منظر پر مبصروں نے بڑی نکتہ چینی کی ہے اور بالکل بجا کی ہے اس بلا کا ماتم نہ دیکھا اور نہ سُنا۔ مانا کہ ایک ہزیمت تھی مگر نہ ایسی کہ گویا سلطنت خاک سیاہ ہوگئی اور تخت و تاج چھن گیا اور خود شہریار کی جان پر بن گئی اور شاید یہ بھی ہوتا تو بے شک ایک گری ہوئی قوم تو شاید اس قسم کا کہرام جایز رکھتی مگر ایک با اقتدار، سنجیدہ، مدبّر اور بردبار قوم بھلا اس قسم کا ماتم کب اپنی دلیرانہ زندگی کا ثبوت سمجھتی۔ مگر معاملہ وہی تھا کہ یونانیوں کی نگاہ میں اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کیا مقام ہوسکتا تھا کہ وہ اپنے ماتم کا بدلہ اس نقلی اور مبالغہ آمیز نوحہ وسینہ کوبی میں دیکھتے۔ بظاہر تمثیل کا یہ حصّہ کمزور نظر آتا ہے مگر چونکہ یہ تمام منظر سوزخوانی اور نغمے کے ساتھ نوحہ اور مرثیہ سے تعلق رکھتا تھا اور تمثیل کو ایران کے الم اور یونان کی تفریح پر ختم کرنا تھا۔

اس لیے یہ تمام حصّہ منظوم مکالمے کا ہے۔

اس موقع کے لیے ایسکلس نے نوحہ گر بھی وہ بلائے جو اس دور کے مسلّم پیشہ ور تھے یعنی مریندانی، مائیشیہ اور مرنیدان جو ایشیائے کوچک کے یونانی ساحلی علاقوں کے باشندے تھے ماتم کرنے میں شہرۂ آفاق تھے۔ ان کا ماتم کیا بَیْن ہوتا تھا جس کی مثال بعض مقامات میں اب بھی ملتی ہے۔ اسی واویلا، واحسرتا، وامصیبتا اور پیٹک پیّا پر یہ المیہ تمثیل ختم ہو جاتی ہے۔

ضمناً اور جزئی طور پر تمثیل پر نکتہ چینی ضرور ہو گئی ہے مگر تفصیلی تجزیہ اور نقد و نظر ہنوز باقی ہے مگر مقدمہ اتنا طویل ہو چکا ہے کہ اب یہ کام اہلِ نظر پر چھوڑنا مناسب ہے۔

آصف علی

فروری ۱۹۴۳ء - احمد نگر

چند نوٹ

(۱) **مرثیدانی** پیشہ ور ماتم کرنے والوں کا شجرۂ نسب تلاش کیا جائے تو ممکن ہے کہ اُن غالی نوحہ گروں کے خاندان اس سے وابستہ نظر آئیں جو آج بھی مل جاتے ہیں۔

(۲) **ہیلاس** یونان قدیم کو فی الجملہ مرز بوم ہیلاس کہا جاتا تھا۔ ہیلینی تہذیب سے آج بھی یہی یونانی تہذیب مراد ہے۔

(۳) **سوسہ** ایران قدیم کا پایۂ تخت سوسہ تھا جسے شوشہ بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ مقام کوہ بے ستون، یا بموجب تحقیقِ جدید بہستون کے قریب تھا۔ اب اس کے آثار بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ڈھائی ہزار برس پہلے روے زمین پر اس کا ثانی نہ تھا اور کل مہذب دنیا کے سفیر اور چیدہ چیدہ ممالک کے شاہزادے اور امیر یہاں دست بستہ حاضر رہتے تھے۔

(۴) **اکتبانہ جو اب ہمدان ہے** یہ وہی مقام ہے جو قدیم زمانے میں

ہمگتانہ تھا۔ اگبتانہ (مادیا میدیہ کا دارالسلطنت تھا) ابتدا میں یہ شمالی حکومت کا دارالسلطنت تھا مگر جب دارا کے زمانے میں شمال کا کل علاقہ سلطنتِ ایران میں آگیا تو شہنشاہ ایران کچھ زمانہ وہاں گزارتا تھا گویا یہ گرمی کے زمانے کا دارالسلطنت بن گیا تھا بعد ازاں عربوں کے زمانے میں یہ ہمدان ہوگیا اور اب ہمدان ہی کے نام سے مشہور ہے۔

(۵) میمفسیہ

میمفِس یا میمفسیہ قدیم مصر کا شمالی یا زیریں مصر کا دارالسلطنت تھا حقیقت میں یہ مقام بھی آخری دور میں چمکا تھا ورنہ مصر کے قدیم پایہ تختوں میں سب سے زیادہ مشہور تو نُو تھا جس کا عہد عتیق (انجیل) میں ذکر آتا ہے۔

(۶) تیبیس یا طیبیس

تھیبیز۔ یا طیبیس یہ جنوبی بالائی مصر کا قدیم دارالسلطنت تھا۔ اگرچہ یہ بھی قدیم زمانے میں بدلتا رہا۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ آیا یہودیوں نے اسی کو نُو کہا تھا یا اور کسی مقام کو۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ شاید اسی کو نُو کہتے تھے۔ آیتن راع جسے آخن آیتن بھی کہتے ہیں ایک روشن دماغ فرعون گزرا ہے اس نے قدیم دارالسلطنت کو بدل کر دو سو میل اور جنوب میں جاکر ایک نیا شہر آباد کیا تھا مگر آیتن راع کے پجاریوں نے ایسی شورش بپا کی کہ اسے پرانے شہر

میں واپس آنا پڑا۔ بہر کیف یونانی پرانے مصر کے دار السلطنت کو طیبیس ہی کہتے تھے۔

(۷) فرامرز، مرزبان، خشترپا قدیم ایران میں قلعہ داروں کو فرامرز، سرحدی صوبہ دار مرزبان اور ممالک محروسہ کے نائب السلطنۃ خشترپا (چھترپتی) کہتے تھے۔ دارا اور اردشیر کے زمانے میں نو خشترپا تھے۔ یعنی نو وائسرائے تھے جس میں خود شہنشاہ کے قریبی عزیز بھائی یا چچا بھی تھے۔

(۸) ہیلیس وہ مقام جو اب درۂ دانیال کہلاتا ہے۔ قدیم یونان میں ہیلیہ یا ہیلی آبنائے کہلاتا تھا۔

(۹) باسفورس بوسپورس یا باسفورس کا ذکر دیباچہ میں آچکا ہے۔

(۱۰) پروپونٹیس پروپنتس وہ آبنائے ہے جہاں سے پونٹیس یعنی بحر اسود بوسپورس میں داخل ہو کر بحیرہ مارمورا میں پہنچتا ہے۔ یہ مقام زمانۂ قدیم سے نہایت پُر فضا تصور ہوتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ اس تمثیل میں اس کا ذکر جس طرح آیا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ یہاں بڑے بڑے عالیشان محلات اور سر بفلک کشیدہ قصور اس زمانے میں بھی موجود تھے اور ساحل پر ان کی قطاریں اس طرح واقع ہوئی تھیں کہ وہ "ساحل کے سینے پر ایک مالا" معلوم ہوتے تھے اور رات کو "دیپ مالا" بن جاتے تھے۔

(۱۱) باختر قدیم ایران کے باجگزار ممالک میں جو[۵۴] اقطاع ایشیا و مصر میں باختر اور صُغد انتہائے سرحد پر شمال مشرق میں تھے۔ یہاں ایران اور چین کی سرحد مل جاتی تھی۔ باختر اور صُغد کا بڑا زمانہ رہا ہے۔ ایران کی بربادی کے بعد باختر یا بکتریہ کی جدا ایک سلطنت بن گئی تھی جو سکندرِ اعظم کے بعد بھی کئی سو سال تک قائم رہی۔ آج بلخ اور بخارا اسی علاقے میں ہیں۔

(۱۲) سویدکان مصر قدیم کا علاقہ تھا جو ایران کے ماتحت آگیا تھا۔

ناٹک

پارسی

(الف)

نثر

محلِ وقوع : دارا کے مقبرے کا پیش منظر

اداکار : (۱) آتسہ : دارا کی ملکہ اور اردشیر کی ماں

(۲) دارا کی روح

(۳) اردشیر : شہنشاہِ ایران

(۴) طائفہ و سرِ طائفہ : بزرگانِ مملکتِ ایران

پیام بر۔

(زمانۂ وقوع۔ سنہ ۴۸۰ قبل مسیح ؛ زمانۂ تمثیل۔ سنہ ۴۷۲ قبل مسیح)

تمثیل اثینیہ میں پیش ہوئی۔

طائفہ جلوس بنا کے داخل ہوتا ہے۔ نغمہ کوچ۔

طائفہ : (سرطائفہ)

ہم ایران کے قدیم پاسبان اور کاخ زریں کے نگراں ہیں۔
ساحل ہیلاس پہ فوج کشی کے موقع پر دارا کے فرزند اردشیر نے
ہمیں اس لیے منتخب کیا تھا کہ اس وقت تک کہ فتحمند فوج سوسہ
کی فرحت بخش سرزمین میں واپس آئے، ہم ایشیا کی حفاظت
کریں اور زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھیں۔
مگر بادشاہ اور ایرانی سپاہ کا خیال مجھے بے چین کیے دیتا
ہے۔ دل میں تاریک وسوسے آ کے پیش گوئی کرتے ہیں۔ آثار
اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

جس دن سے ایشیا کا لشکر جرار جسے نوجوان بادشاہ نے
معرکہ آرائی کے لیے تیار اور مسلح کیا تھا پردیس روانہ ہوا، مجھے
رہ رہ کے شہنشاہ کا خیال آتا ہے اور میں پریشان ہو جاتا
ہوں۔

اس دن سے ایرانی ایوانوں میں نہ کوئی پیک آیا، نہ شہسوار، نہ کوئی اُڑتی اڑتی خبر۔

وہ بھی کیا دن تھا کہ سُوسہ اور اکتبانہ کے (شہروں اور) قلعوں سے بہادر جنگجو جنگی نظم و ترتیب سے نکلے تھے۔

جس بحری بیڑے اور بری لشکر نے کوچ کیا تھا پیدل اور سوار ملا کر ایک عسکر جرار اور فوج بے شمار تھی۔

اس لشکر کے سپہ سالار اردفیرپا اور آمیسترتھے اور نائب میگبات اور ارتاسپ۔

دولتِ ایران کے قریب و بعید ممالک کے فرماں روا اور سرخیل شہنشاہ کے اعلان جنگ پر فرمان کی تعمیل میں حاضر تھے۔

تیر و کمان سے آراستہ زرہ پوش بہگروں کی جنگجویانہ شان قابلِ دید تھی۔

ان دلاوروں میں (ایک تو) پیکار جو اردعنبر بزدلوں کا زہرہ آب کرنے والا تھا جو خفتان استقامت سے آراستہ شہ سواری کا دلدادہ تھا۔

دوسرا دشمنوں کو ہدف خدنگ بنانے والا آمیوش تھا دیگر فراندق، ماسیدر اور سسدران، جو میدان کارزار میں گھوڑوں پر چابک کڑکاتے اور جنگی رتھوں کو ہانکتے ہیں۔

اُس وسیع وادی سے جو عظیم الشان رودِ نیل سے سیراب ہوتی ہے۔ دلاوروں کے کئی جیش آئے تھے۔ سوسیکان اور مصر کے سپوتوں کا سالار بجستہ گون تھا۔ اور میمفسیہ کے پرہیزگار گروہ

آرسامی کے تابع فرمان تھے۔ قدیم طیبیس کے شجاع فرزند آریو ماردوس کے ماتحت تھے۔ ان کے علاوہ دلدلی جھیلوں کے علاقے کے باشندے جو بہت بڑے بڑے چپوؤں سے کشتی رانی کرنے کے عادی ہیں، بے شمار تھے۔

(ان کے علاوہ) ساکنین لدیہ تھے جنھیں اپنے کوہ فرسے کوچ کرنے پر ناز ہے۔

مختلف قبائل کے سرلشکر جو بر اعظم کے دور دراز اور نزدیک علاقوں سے آئے تھے۔ ارکتوس اور میترا گیس تھے۔

یہ کل حکمراں شہنشاہ کے مطیع و منقاد ہیں۔

سنہری سار دیس سے وہ معرکہ آرا بھی شریک مہم ہونے آئے تھے جن کی رتھوں میں گھوڑے جڑے ہوئے تھے (ان میں سے) بعض میں دو اور بعض میں تین جوڑیاں جتی ہیں جنھیں دیکھنے سے ہول آتا ہے۔

کوہ طموس سے ماردون اور ساربیس بھی یونان کی گردن پر اپنا جوا دھرنے کو شریک ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کی چھاتی برچھوں کے مقابلے میں ایسی رہتی ہے جیسے گھن کے سامنے نہائی۔

ان کے علاوہ مائیشیا کے وہ جوان ہیں جو تفنگ اندازی کے ماہر ہیں اور وہ بھی جو طوفانی موجوں کی سواری کرتے ہیں۔

زرین بابل سے مختلف قوموں کا جم غفیر آیا ہے جس میں وہ

ؔ مراد ان باشندوں سے ہے جو رودنیل کے دہانے کے علاقے میں رہتے اور جہاز رانی کرتے تھے۔

جانباز ہیں جو کمان زہ کرنے میں اور ناوک فگنی میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ نزدیک و دور کی وہ ایشیائی قومیں جن کی کمریں نیمچوں سے آراستہ ہیں دیجاہ شہنشاہ کی جلو میں ہیں۔

نونہالانِ ایران کے گلہائے سرسبز اس رن میں شریک ہونے گئے ہیں اور جس سرزمین میں وہ پروان چڑھے سونی پڑی ان کی راہ تکتی ہے۔ مائیں اور بیویاں روز انتظار کی کٹھن گھڑیاں اس ہول میں کاٹتی ہیں کہ نہ جانے زمانے (کے شکم) سے کیا برآمد ہو۔

مناجات طائفہ

طائفہ مقابل۔ (استروفی) (۱)

بلاد و امصار کو زیر و زبر کرنے والا اس ساحل پر جو مقابل کے لشکر کے ہمسایہ میں ہے، بحر مفرور عبور کر کے پہنچ لیا۔

بادشاہ نے مجمع البحرین پر تختوں کا پل بندھوا دیا کہ منظم عسکر اس پر سے پار اُترے۔ درۂ ہیلیہ (درۂ دانیال) کی تند موجوں کو رسن و سلاسل سے جکڑ دیا گیا اور قلزم کی گردن پر (غلامی کا) شاخہ رکھ دیا گیا۔

مد مقابل طائفہ۔ (برعکس استروفی) (۱)

ایشیائی نبرد آزماؤں کا مایۂ ناز، بے شمار لشکروں کا سالار، کثیر گلوں کا گلہ بان پرچم فیروزمندی اڑاتا ہوا جا پہنچا۔

(ہاں) یہ وہی ہے جسے پیادہ فوج اور زرہ پوش سواروں پر ناز ہے۔ وہی جو ملّت زرّیں کا چراغ، برّی اور بحری قوّت کا

زور آزما، اور فانی ہوتے ہوئے غیر فانی دیوتاؤں کا ہمسر ہے،

طائفہ مقابل (۲)

نظر تو کرو! یہ وہی ہے جس کی آنکھوں میں مہیب اژدہے کی آنکھ کے شعلے کی طرح نیلا شعلہ روشن ہے۔

(والیِ برج) حمل کی طرح ترکش بردوش، سریائی رتھ میں متمکن صف بر صف لشکر کے قلب میں (یونانی) نیزہ افگنوں کے مقابل سالاری کر رہا ہے۔

طائفہ مد مقابل (۲)

دیکھنا تو یہ ہے کہ جب وادی و دیار میں اہلِ یونان امنڈتی ہوئی موجوں کی طرح پھیل جائیں گے اور جنگ بپھرے ہوئے سمندر کی طرح چھا جائے گی۔ پلّہ کس کا بھاری پڑتا ہے۔

کوئی ہے جو ایرانی دلیروں کے دست بدست اور رو بہ رو رزم آزمائی کی تاب لاسکے؟

مستزاد

دیوتا جب اپنی کرنی پر تُل جاتی ہیں تو یہ غیر فانی قوتیں آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ کون ہے جو بچ کر نکال جائے! کون ہے جو اس پھندے کو پھاند جائے!

اندر ہی اندر دھوکہ کا جال پھیلاتے، مسکراتے ہوئے بڑھتے ہیں اور سکار پر اچانک ٹوٹ پڑتے ہیں اور یہ مظلوم جال میں پھنسا تڑپتا دکھائی دیتا ہے!

طائفہ مقابل (۳) مقدر میں یہی لکھا ہے! امن ایران کے نصیب میں نہیں!

اے ایران! تیری تقدیر میں جدال و قتال ہی لکھا ہے! غیب سے یہی آواز آتی ہے کہ تیری تقدیر میں دیار و امصار کی تاخت و تاراج اور شہسواروں کی تگ و تاز ہی آئی ہے۔

مدمقابل طائفہ (۳)

جب بحر کا دہانہ طیش کے کف سے ڈھکا ہوا تھا؛ جہاں طوفانی سمندر باد تند کے غرّانے کا جواب دہاڑ دہاڑ کے دے رہا تھا؛ جس مقام کو عبور کرنے پر دل نہیں ٹھکتا تھا' وہاں سے ایرانی لشکر پار اتر گیا

اس مقام پر متلاطم بحر موّاج پر تختوں اور رسوں کا پل باندھا گیا تھا جہاں گذرنے والوں اور ملک عدم کے درمیان صرف یہ تختہ بندی حائل تھی۔

مقابل طائفہ (۴)

اسی وسوسہ کی چادر نے تو میری روح کو ڈھانک لیا ہے!

مدمقابل طائفہ (۴)

جبھی تو خوف کا کانٹا میرے دل میں کھٹک رہا ہے، خدا نہ کرے کہ میرے کانوں میں یہ آواز آئے " وائے بر عسکر ایران! واحسرتا! سوسہ! تیری گود تیرے بچّوں سے خالی ہو گئی، تو سونا اور بھیانک ہو کے رہ گیا!

مقابل طائفہ (۵)

خدا نہ کرے جو سوسی قلعے میں یہ صدا گونجے! خدا کرے میرے کانوں میں عورتوں کی آہ وزاری کی آواز نہ ڈالے۔ میری آنکھیں یہ

دردناک نظارہ نہ دیکھیں کہ عورتیں اپنی بیش قیمت پوشاکیں اپنے
ہاتھوں سے اپنے سینوں پر چاک کریں۔

مدمقابل طائفہ (۵)

ہمارے پیدل اور سواروں کے لشکر مہال کی مکھیوں کی طرح
بادشاہ کے ہمرکاب گئے اور انھوں نے ادھر ایشیا اور ادھر
سراقیہ کے مابین مجمع البحرین پر ایک معبر تیار کیا۔

مقابل طائفہ (۶)

بیویاں اپنے پیارے شوہروں کی سیجوں کو آنسوؤں سے
تر کر رہی ہیں، ایرانی عورتوں کی زندگی حسرتوں کے ازدحام میں
تیر ہو رہی ہے۔

ان کے بالم بلّم لیے جہاں تہاں سرگرداں ہیں اور یہ فرقت زدہ
اکیلی جدائی کے دن گھروں میں کاٹ رہی ہیں!

مگر اے ایرانی بزرگو! آؤ ہم سب اس قدیم ایوان میں بیٹھ
کر اپنے بادشاہ ظل اللہ، شہنشاہ دارا کے فرزند دلبند کے نوشتۂ
تقدیر پر نگاہ دوربیں سے غور و خوض کریں۔ وہ ہمارا خون ہے
اور اُسی سے ہمارا نام روشن ہے۔

ہمیں اندازہ لگانا چاہیے کہ فیروزمندی کا سہرا ہمارے
خدنگہائے پراں کے سر رہا یا (یونانیوں کے) سنان نوکدار
کے!

مگر ادھر نظر تو اُٹھاؤ! اردشیر کی والدہ ماجدہ، ہماری ملکہ
چشم ایزدی کی طرح روشن تشریف لا رہی ہیں! ہمیں سجدہ کورنش

بجا لانا لازم ہے۔

اے ہماری ملکہ، اے مادر اردشیر آئیے!
(آتُسہ کے داخلے پر اسے مخاطب کرکے)

اے روے زمین کی عورتوں کی ملکہ! دخترانِ ایران کی سرتاج! بندگی عرض ہے!

پادشاہ اردشیر کی والدۂ بزرگ سال! دارائے اعظم کی ملکہ! کورنش عرض ہے!

اس کی شاہ بیگم جو دیوتا تھا، اور اس کی ماں جو دیوتا ہے خدا کرے جب نصیب نے ایرانی دلاوروں کا سر ایامِ قدیم سے شادکامی کے تاج سے مزیّن رکھا (ہمیشہ) دیدۂ بیدار رہے۔

(آتُسہ ارابۂ شاہی میں سوار تزک و احتشام سے داخل ہوتی ہے)

آتسہ: میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ مجھے اپنے اور دارا کی خوابگاہ اور ایوانِ زریں سے نکل کر یہاں آنا پڑا۔ میرے دل میں وہم کا کانٹا چبھ رہا ہے اور میں اپنے اس اندیشے کو اپنے رفقا پر ظاہر کرنے آئی ہوں جو میرے سینے میں پنہاں ہے اور جس نے مجھے گھیر رکھا ہے۔

(میں ڈرتی ہوں کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ دولت وحشمت وافر کا تکبر ہمارے عیش و آرام کو خاک میں ملادے (اور) وہ گنج جو عنایتِ ایزدی سے دارا نے جمع کیا تھا غارت ہوجائے۔

میرے دل میں دوہرا اندیشہ ہے (ایک تو یہ کہ) میں

اس پرانی حقیقت پر غور کرتی ہوں کہ مردوں بغیر دولت بے سود
ہے، اور دولت بغیر سلطنت کتنی ہی وسیع ہو راحت کی روشنی
سے محروم رہتی ہے۔ (دوسرے) دولت بجائے خود منحوس نہ بھی
مگر (یہ سوچ کر کہ) چشم بے بصر بے کار ہے، کانپ اٹھتی ہوں۔
آنکھ بینائی سے اور گھر آقا (کے دم) سے ہے۔

مملکت ایران کے دانشمند معتمدو! تم میرے وسوسہ اور پریشانیِ
خاطر کی داستان سُن چکے۔ دانشمندی اور فراست کا تم پر انحصار
ہے۔ اب تم اپنی رائے سے مجھے مستفید کرو!

طائفہ: اے ملکۂ مرزبوم ایران! آپ یقین فرمائیں کہ آپ ہم سے جو بھی
عملی یا مشورتی خدمت طلب فرمائیں، ہم حتی المقدور آپ کے ارشاد
کے دوہرانے کا موقع نہ آنے دیں گے۔

آپ کے ارشاد کی حتی المقدور تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔

آتسہ: جس دن سے میرا لختِ جگر دولتِ یونان مسخر کرنے لشکر لے کے
سدھارا ایک رات ایسی نہیں آئی کہ مجھے خوابِ (بد) نظر نہ آئے
ہوں۔ مگر جو خواب میں نے کل دیکھا بہت صاف تھا اور اب تم
سرگذشت سنو!

(خواب میں) میں نے دو عورتیں زرق برق لباس پہنے دیکھیں
(ان میں سے) ایک کی پوشاک ایرانی اور دوسری کی دُریانی
(یونانی) تھی۔ دونوں بے عیب حُسن کا نمونہ، اوسط سے دراز تر
قد اور دونوں ایک ہی نسل سے۔ ایک ہیلاس (یونان) اور دوسری
برِاعظم ایشیا کی رہنے والی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں میں کشمکش ہوئی

اور میرے فرزند نے یہ دیکھ کر دونوں کو پکڑ کر اپنے ارابہ میں جوڑ دیا اور شاخہ ان کی گردنوں پر رکھ دیا۔ ایک نے تو شاہی لگام سے آراستہ ہو کر ناز سے سربلند کیا، اور دوسری نے دولتیاں ماریں، گردنی اور بم توڑ پھوڑ، لگام تڑا کے بھاگ نکلی۔ میرا لال زمین پہ آرہا اور اس حالت میں دیکھ کے دارا مدد کو پہنچے اس پہ میرے اردشیر نے اپنا جامہ چاک کر ڈالا۔

رات کو میں نے یہ خواب دیکھا اور صبح ایک نئی فال بد ساتھ لائی۔ بیدار ہو کر بدشگونی کے دفعیہ کے لیے میں نے چشمۂ پاک کے پانی سے ہاتھ دھوئے اور حافظ حقیقی کی نیاز کا کاک لے کر چلی تو دیکھتی ہوں کہ خداوند خورشید کی درگاہ کی طرف ایک عقاب اُڑا جا رہا ہے۔ میں سہم کے گُم سُم کھڑی ہو گئی۔ اتنے ہی میں ایک باز نے جھپٹ کے عقاب کی کلغی نوچنی شروع کر دی اور اس سلطان الطیور نے اپنی شان کو انکسار سے نیچے دیا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر مجھ پہ خوف طاری ہو گیا، جیسا کہ تم سننے والوں کا حال ہو گا۔ تم خوب جانتے ہو کہ ایران میں میرے دلبند کا پورا تسلّط ہے۔ اگر وہ فیروزمند واپس آئے بہت خوب۔ ورنہ سوسہ میں اس کا اقبال سلامت ہے۔ یہاں کوئی طاقت نہیں جس کے سامنے وہ جوابدہ ہو۔

طائفہ: اے مادرِ محترم! ہمارے معروضے میں نہ خوف کا ضعف ہے نہ جرأت کی لاف زنی۔ (ہماری گذارش ہے کہ) آپ پروردگاروں کے حضور میں منت کریں۔ فال بد کا دفعیہ ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔

رہی آپ کی، آپ کی اولاد کی اور آپ کے جاں نثار باشندگانِ شہر کی بہبودی، یہ بھی ان ہی (خداوندوں) کے ہاتھ ہے۔

اس کے بعد ارض اور ارواح کی نیاز کیجیے اور عقیدتِ خاص کے ساتھ دارا کی روح سے جسے آپ نے رات کو خواب میں دیکھا، دُعا کیجیے کہ وہ آپ پر اور اردشیر پر رحمت، برکت اور شادمانی نازل کرے اور آلام و آفات کو عدم کی نابینا تاریکی میں پوشیدہ رکھے۔ میرا دل جس طریقۂ کار کی گواہی دیتا تھا، خدمتِ والا میں بہ نظر خیر اندیشی عرض کیا۔ امیدِ واثق ہے کہ آپ کے اور آپ کے ا۰۱۶ کے نصیب کی خوشی پوری ہوگی۔

آتسہ : بیشک جو تعبیر تم نے ازراہِ رفاقت سنائی، میرے رات کے خواب پر صادق آتی ہے۔ جو لفظ تمھاری زبان سے نکلے وہ میرے نورِ بصر، میرے خاندان اور گھرانے کے لیے تسکین بخش اور امید افزا ہیں اور دعا ہے کہ خداوندان اپنی برکت نازل اور پوری کریں گے۔ تمھاری صلاح اور ارواح کے ارشاد کے مطابق میں محل پہنچ کر مناسب حال نیاز نذر کروں گی۔

مگر دوستو بالفعل میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس وسیع روئے زمین پر مشہور (شہر) اثینیہ کہاں ہے؟

طائفہ : اقصائے مغرب میں اس مقام کے نزدیک جہاں خسرو انوار، خاورِ مشرق جا کر چھپتا ہے۔

آتسہ : میرے لختِ جگر کی بڑی آرزو تھی کہ اس اثینیہ پر اس کا تسلّط ہو۔

طائفر : دور اندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ جس دن اثینیہ مسخر ہوا تمام یونان کا سر اطاعت خم ہو جائے گا۔

آتسہ : ان لوگوں کی کتنی تعداد ہوگی؟ کیا وہ اتنے ہیں کہ میرے پسر کے مقابلے پر آسکیں؟

طائفر : جمعیت تو ان کی اتنی ہے کہ ایک مرتبہ وہ اہلِ میدیہ کو زک دے چکے ہیں!

آتسہ : جمعیت کے علاوہ ان کی طاقت کا کیا حال ہے؟ کیا دولت بھی ان کے پاس وافر ہے؟

طائفر : انھیں اپنی سرزمین کی چاندی کی کانوں پر زعم ہے!

آتسہ : اور کیا وہ تیر انداز بھی اچھے ہیں؟ ہدف پر ان کے ناوکوں کی پرواز کیسی ہے؟

طائفر : کچھ ایسی نہیں۔ مگر ان کے برچھے مضبوط ہیں اور بچاؤ کے لیے وہ سپر کام میں لاتے ہیں۔

آتسہ : ان کا گلہ بان کون ہے؟ یعنی اثینیہ کا فرماں روا؟

طائفر : وہ کسی خاکزاد کے تابع فرمان نہیں ہیں جس کا نام بتایا جائے۔ وہ کسی زندہ بشر کے غلام نہیں۔

آتسہ : ایسا غول ایک متحدہ جیش کا کیونکر مقابلہ کر سکتا ہے؟

طائفر : کیوں کر؟ یہ تو دارا کو مہم ہیلاس (یونان) کے موقع پر اسی دم اندازہ ہو گیا تھا کہ جب انھوں نے صفیں کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔

آتسہ : یہ تو تم نے وہ بات کہی جو ہر ایرانی ماں کے دل پر نقش ہوگی۔

طائفہ: مزید حال آپ کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ وہ سامنے سے ایک پیک دوڑتا آرہا ہے۔ ایرانی معلوم ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خبر اہم ہے، خواہ نیک یا بد۔

(پیامبر داخل ہوتا ہے)

پیامبر: اے برِ اعظم ایشیا کے قریات و بلاد! اے دولتِ خطیر کی بندرگاہ، اے ملک ایران، واحسرتا! ایک ہی وار میں تیری شان و شوکت گرگئی! ایک ہی پالے میں سب کلیاں ٹھٹھر کر رہ گئیں!

حیف! اس خبر نحوست اثر کا پیامبر میں ہوا۔ مجبور ہوں، ضرورت کا تقاضا ہے کہ حقیقت آشکارا ہو۔ ایرانیو! عجمی لشکر اجل کے گھاٹ اُترا۔

مقابل طائفہ: وائے بدنصیبی۔ وائے شومی مقدر۔ سیہ بختی! حیف صد حیف! ماتم و نوحہ، صدمہ و آلام! ایرانیو! آہ و بکا کرو، سینہ کوبی کرو۔ تازہ زخموں پر آنسو بہاؤ۔

پیامبر: سب خاک سیاہ ہوگیا۔ کچھ باقی نہ بچا۔ ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ مگر آفتاب ایران میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

مدمقابل: واویلا۔ کیا پیری اسی روزِ بد کے لیے گھسٹ رہی تھی کہ یہ آنکھیں ایران کی امیدیں خاک میں ملتی دیکھیں اور اپنے دکھ پر آنسو بہایا کریں؟

پیامبر: ایرانیو! میرا بیان سنا سنایا نہیں۔ میں بربادی کے سیاہ ترین نظارے کا حال سنا رہا ہوں۔ جو ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔

مقابل طائفہ: وائے بدنصیبی! وہ تُند اور تنی کمانیں، وہ سَن سے اُڑتے ہوئے تیر، وہ مادیوں کے دل بادل لشکر، ہیلاس مقدس کے مقابلے میں ہیچ ہو کر رہ گئے!

پیامبر: ہمارے جانبازوں کے لاشوں سے سالامیس کا تمام ساحل پٹا پڑا ہے۔

مقابل طائفہ (۲): ہیہات! بیڑہ کے سازوسامان کے تباہ شدہ بقیہ پر افسوس! پارہ پارہ کشتیوں، شکستہ تختوں اور بہتے ہوئے لاشوں پر افسوس، جو خانہ بدوش سمندر کے مدوجزر میں جھکولے کھاتے ہوں گے۔

پیامبر: دشمن کی برنجی انیوں کے سامنے ہمارے لشکر بیکراں کے ناوک بے سود رہے۔

مقابل طائفہ (۳): ماتمیو! آہ و بکا کرو۔ دردانگیز نوحہ کرو۔ جگر شگاف نالہ کرو! ہمارے سب پیادہ اور سوار لشکری کھیت رہے۔ بالکل ختم ہو گئے۔

پیامبر: سالامیس! تجھ پر لعنت ہو! خدا ترا نحس نام نہ سُنائے! اثینیہ! تیرا نام دل میں آہ بن کر آئے گا!

طائفہ: اثینیہ! اثینیہ! تو نے ہمارے پاس کچھ نہ چھوڑا۔ اور چھوڑا بھی تو کیا؟ مائیں جن کے لال نہ رہے۔ زارونزار بیویاں جن کے خاوند نہ رہے!

آتسہ: تم دیکھتے ہو میں دم بخود ہوں۔ اس جانکاہ صدمے نے مجھے گم سم کر دیا۔ نہ مجھ میں اپنے رنج کے اظہار کا یارا رہا۔ نہ دوسرے

کی بپتا پوچھنے کی طاقت - مگر جب دیوتاؤں کی طرف سے مصیبت نازل ہو تو بشر فانی کو صبر کا سبق سیکھنا چاہیے! (اے پیامبر) تحمل سے کام لے، بیان کتنا ہی دردناک ہو مگر مصیبت کی داستان پوری کہ سنا! ہمیں لازم ہے کہ آخر تک سنیں۔ وہ نقصانات بتا جو نوحے کے مستحق ہیں۔ کن کن صاحبِ عَلَم سرخیلوں کے لشکر بے سردار ہو کر گھر لوٹیں گے؟

پیامبر: بادشاہ اردشیر سلامت ہیں۔ ان کا دیدۂ بینا نور آفتاب کا ناظر ہے۔

آتسہ: تیری یہ خبر میرے اور میرے خانوادے کے لیے نور سے معمور ہے۔ شب تاریک سے یہی روز روشن نمودار ہوا ہے۔

پیامبر: سواروں کے دہ ہزاری سردار ارد عنبر کا قالب بے جان سالامیس کے پتھریلے ساحل پر پڑا ہے۔ یک ہزاری بحری امیر دیدائیس نے برچھی کھا کر سیدھا سمندر میں غوطہ کھایا۔ یہ غوطہ کتنا سہل تھا! خالص باختر زاد شریف النفس طیناغون کی نعش جزیرۂ اپاقس کے پاس موجوں کے تھپیڑوں میں تیر رہی ہے۔ لیلائی، ارسامی اور ارگیستی کے بے جان جسم پاتلوں کے جزیرے کی موجوں میں چٹانوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ فرتقو، فریسو، آدی یو اور ارکقو وادی نیل کے باشندوں نے جہاز پر سے قلابازی کھائی اور ایک ہی مدفن میں دفن ہو گئے۔ وہ فرسینی سرخیل مرطانوس کہ جسے اپنی سیاہ ریش پر ناز تھا اور جس نے تین بار ہیلاس پر دس ہزار سیاہ پوش سواروں

سے چڑھائی کی تھی، اس حال میں ہے کہ اس کی سیاہ ریش خون سے قرمزی ہو کر رہ گئی ہے۔ مجوسی آرابوس، اور باختری ارتام بھی اسی ساحل پر بے تکیہ سو رہے ہیں۔ آمیستر اور امفیستر بھی وہیں دراز ہیں۔ اور سار دیس کے ساکنین ان کی قسمت پر بجا طور پر رو رہے ہیں۔ نیز مائیسٹی سرسام ان ہی کے ساتھ رہا اور سریانی سار بیس جو ڈھائی سو جہازوں کا امیر تھا سنگدل ساحل پر بے بس پڑا ہے۔

سائنیسیس صیقلوی سردار نے تن تنہا ہزاروں کے برابر کام کیا اور غنیم کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیں۔ اس نے ایک نام ور بہادر کی موت پائی۔

یہ میں نے بہتوں میں سے چھانٹ کے ان راہیانِ عدم کے نام لیے ہیں کہ جو سر بر آوردہ تھے اور کھیت رہے۔

آتسہ: آہ! آہ! جو کچھ سُنا بہت ہے! ایرانیوں کے حصّے میں ندامت اور آہ و بُکا آئی ہے!

مگر اپنا بیان وہاں سے دوہرا کہ (جہاں بحری معرکے کا ذکر ہے) آخر یونانیوں کے ایسے کتنے جہاز تھے کہ انھوں نے ایرانیوں کے بیڑے کا سینہ بہ سینہ مقابلہ کرنے کی جرأت کی؟

پیامبر: ملکہ یقین فرمایئے کہ اگر فتح کا دارومدار جہازوں کی تعداد پر ہوتا تو فتح ہماری ہو چکی تھی۔ یونانیوں کے پاس لے دے کے تین سو جہاز تھے۔ اور دس جن کا ساز و سامان نیا تھا۔

بادشاہ اردشیر کے جہازوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ اور ان کے علاوہ دوسو بادبانی جہاز تھے اور سات صبا رفتار تھے اور یقین مانئے بچاؤ کے لیے تدبیر اور طاقت جو کچھ کر سکتے تھے سب کیا گیا۔ ہماری بربادی تو کسی دیوتا کا کام تھا۔ ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہوا! (دیوی) پلّاس نے اپنے شہر کی حفاظت کی!

آتسہ: اور شہر؟ کیا وہ محفوظ رہا؟ کیا اثینیہ جوں کا توں ہے؟

پیامبر: جی ہاں، وہ جوں کا توں ہے، اور وہ بھی بغیر شہر پناہ کے! اس کا حصار صرف آدمیوں کی دیوار کا تھا!

آتسہ: مگر یہ بتا کہ جنگ کی ابتدا کدھر سے ہوئی؟ یونانیوں نے (ابتدا کی) یا میرے فرزند تاجدار نے، کیونکہ اسے لشکر کی کثرت پر بھروسہ تھا؟

پیامبر: لڑائی یا تو کسی منحوس دیوتا نے شروع کی، یا کسی منتقم عفریت نے (ہوا یہ کہ) یونانی بیڑے سے ایک آدمی پہنچا اور اس نے آپ کے نورِ نظر کی خدمت میں التماس کیا کہ "رات کا اندھیرا ہوتے ہی ایک یونانی نہیں ٹھہرے گا بلکہ اپنے بچو سنبھال کے جس کا جدھر سینگ سمائے گا چھپ کے نکل جائیں گے۔" شاہ اردشیر نے یہ سنا مگر یونان اور خداوندان حسّاد کے فریب سے بے خبر رہے۔ انھوں نے اپنے امرائے بحر کو حکم دیدیا کہ جونہی آفتاب شعاع عالمتاب کو واپس بلائے اور صنم کدۂ افلاک پر اندھیرا چھا جائے

بیڑے کو تین صفوں میں مرتب کیا جائے اور جزیرۂ ایاقس کے تمام موج شوئیدہ دروں کو گھیر لیا جائے۔ اگر کوئی نگہدار دستہ یونانیوں کے فریب میں آگیا اور کسی کو آنکھ بچا کے جہاز نکال لے جانے دیا تو دستے کے سردار کی پاداش اس کا سر ہوگا۔ آپ کے دلبند نے یہ احکام شان سے صادر فرمائے اور ان کے دل میں یہ خیال نہ گزرا کہ دیوتا کس آسیب کا جال پور رہے ہیں۔ سرداروں نے تعمیل فرمان کی اور ہر ایک نے اپنا توشہ تیار کیا اور ملاحوں نے ڈانڈیں کھونٹوں میں باندھ کے تیار کر رکھیں۔ پھر خورشید کا نوری جلال جب ٹھنڈا پڑنے لگا اور رات جھپٹ کے پہنچی کل امراے بحر اور منتظمان اسلحہ کے جہازوں نے لنگر اٹھا دیئے ہر صف نے دوسری کو اپنی جگہ صف آرائی کرنے کو پکارا۔ رات بھر کشتیاں کھیئی گئیں اور آبنائے کے گرد تیرتی ہوئی فصیل بن گئی۔ پو پھٹنے پر (دیکھا کہ) خلاف توقع ایک یونانی نے بچ کے نکل جانے کی کوشش تک نہ کی۔

بالآخر دن سفید براق گھوڑوں پر سوار یک لخت بحر زخّار پر ٹوٹ کے پہنچا۔ نظارہ بڑا دلکش تھا۔ سب سے پہلے یونانیوں کی طرف سے ایک سریلی گلبانگ بطورِ شگونِ نیک بلند ہوئی۔ اور گھاٹوں کی چٹانوں نے اس کا بلند گونج سے جواب دیا۔ بے سود قیاس کا فریب ختم ہوگیا۔ ایرانی فوج پر خوف طاری ہوگیا۔ یونانیوں کا پرچم مذبذب لہروں کی طرح نہیں

بلکہ مردانِ پیکار جو کے اس بشاش نعرے کی طرح جو غنیم کو آمادۂ رزم کرنے کے لیے لگایا جائے، ہوا میں لہرا رہا تھا۔

پھر سمندر پر قرنائے کی آواز پھیل گئی اور دریائے شور میں جیو پڑ گئے۔ جن کی تال کے ساتھ سپاسپ کی آواز آنے لگی۔ یونانیوں کی کل صفیں بڑی پھرتی سے آراستہ ہو کر مقابل آ گئیں۔ پہلے راست نے حملہ کیا پھر سارا بیڑہ ٹوٹ پڑا۔ اور ایک فلک شگاف نعرہ بلند ہوا کہ "فرزندانِ یونان بڑھو۔ اے آزاد ملک، آزاد اولاد اور آزاد بیویوں والو! اپنے ملک کے دیوتاؤں کی درگاہوں اور اپنے بزرگوں کے مزاروں کو بچا لو۔ آج سب کچھ داؤں پر لگا ہوا ہے۔"

اسی قسم کا ایک نعرہ ہماری صفوں نے فارسی میں لگایا۔ پھر تو وار نہیں آیا۔ جہاز پر جہاز برنجی ناکے جوڑے ہمارے جہازوں سے دھڑا دھڑ ٹکریں لینے لگے۔ پہلا وار ایک یونانی جہاز نے کیا۔ اور ایک فینیقی جہاز کی پیشانی پر سے بُت توڑ کے گرا دیا۔ پھر کیا تھا، سب جہاز جان توڑ کے ایک دوسرے سے گتھ گیے۔ اول اول تو ایرانی بیڑے کا قلب یہ سخت دھچکا سہار گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ہماری تعداد کثیر ہمارے لیے وبال جان ہو گئی۔ تنگ آبنائے میں ہم اپنی قوت استعمال نہ کر سکے۔ اور ایسے پھنس گئے کہ آپس ہی میں جہازوں کے برنجی ناکے اڑنے لگے اور اپنی ہی بلّیاں توڑنے

پھوڑنے لگے۔ یونانیوں نے بڑی چالاکی دکھائی اور چاروں طرف وار پر وار کیے۔ یہاں تک کہ ہمارے اُلٹے ہوئے جہازوں کے پیندے نظر آنے لگے۔ جہازوں کے ڈھیر اور کشتوں کے انبار سے نیلا سمندر ڈھک گیا۔ سارا ساحل اور کھُردری چٹانیں لاشوں سے پٹ گئیں۔ آخرکار ہمارے جہازوں میں سے جس جس کے پاس چپّو باقی رہ گئے تھے اس نے اس تتّر بتّر ہونے کی حالت میں جدھر منھ اُٹھا بھاگ نکلنے کی ٹھہرائی۔

جہازوں کے ٹوٹے پھوٹے مستولوں، ڈانڈوں اور کشتیوں کے ٹکڑوں سے یونانیوں نے ہمارے پھنسے ہوئے آدمیوں کا اس طرح شکار کیا جیسے بڑی مچھلیوں کا۔ سمندر پر آہ وزاری کا شور چھا گیا۔

بالآخر سیاہ چشم رات نے اس خونریزی (کے منظر) پر تاریکی کا تیر سر کیا۔ یہ ہیں وہ آفتیں جو آپ نے سُنیں۔ کل داستان دوہرانے کو دس دن بھی کم ہیں۔ مگر اے ملکہ یقین جانیے کہ روئے زمین پر آج تک وہ آفتاب طلوع نہیں ہوا جس کے دیدۂ عالمتاب نے اجل کا ایسا نقشہ دیکھا ہو۔

آتسہ : ایران اور ایران کی شہرت پر کن آفتوں کا سمندر امنڈ آیا۔

پیامبر : آپ نے تو ابھی آدھی بات بھی نہیں سُنی۔ جو کہنی باقی ہے وہ اس سے جو کہہ چکا ہوں دوگنی بڑھی چڑھی ہے۔

آتسہ : اس سے بدتر اور کیا ہوگا۔ ہم تو پہلے ہی تباہ ہو چکے۔ اب اور کیا رہا ہے جو اس سے زیادہ رنج دہ ہوگا۔

پیامبر : وہ تمام نوجوان جو ایران کے شباب کے پھول تھے۔ جو شجاعت میں اول نجابت میں افضل تھے اور جن شاہزادوں پر آپ کے فرزند کا خاص اعتماد تھا (سب کے سب) بڑی رسوائی کی موت مرے۔

آتسہ : ہائے! میں سیہ بخت یہ سننے کو کیوں زندہ رہی۔ مگر بتا تو سہی جو ایرانی شاہزادے کس طرح راہی عدم ہوئے؟

پیامبر : سالامیس کے بالمقابل سرزمین اطیقہ کے نزدیک ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ یہ مقام رقص کے شیدا پان دیوتا کی سیرگاہ ہے جو جہازوں کے لیے ناسازگار ہے۔ اردشیر نے یہاں اپنے چیدہ چیدہ سرداروں کا تقرر کیا کہ شکست خوردہ یونانی جب وہاں پہنچیں تو ہماری فوج اپنے رفیقوں کی ضرورت کے وقت کام آئے اور منتشر یونانیوں کا آسانی سے شکار کرے اور موت کے گھاٹ اتارے جو پیش آیا اس کے لحاظ سے یہ (انتظام) منحوس ثابت ہوا۔ کیونکہ جب دیوتاؤں کی عنایت سے اس دن فتحیابی کی شادمانی یونانیوں کے حصے میں آئی، تو وہ سر سے پاؤں تک زرہ میں ملبوس جہازوں سے کود پڑے اور لپک کے انھوں نے اس جزیرے کا محاصرہ کر لیا تاکہ ہمارے آدمیوں کے لیے دائیں بائیں کہیں راہِ فرار نہ رہے۔

(پھر تو) کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ کچھ تو پتھراؤ کے دھڑاکے میں کام آ گئے، کچھ بھنبھناتی کمانوں کے تیروں

سے چھدے۔ پھر انھوں نے مل کر ٹوٹ کے دھاوا بولا۔ اور ہمارے بے بس سرداروں کو اس طرح چھانٹ کے رکھ دیا کہ کراہنے کی آواز بھی نہ آئی۔

مگر شہر یار اردشیر نے (اسی موقع پر) ہائے کی ساحل پر ایک نمایاں اونچان سے انھوں نے میدان کارزار کی سیہ بختی پورے طور سے ملاحظہ کی۔ انھوں نے (حالت دیکھ کر) قبا چاک کر ڈالی اور با آواز بلند نوحہ کرنے لگے۔ پھر بچی کھچی فوج کو پسپائی کا حکم دیا اور ان ہی کے ساتھ خود بھی بچ کر نکل گئے۔

دوستو! یہ صدمے پر صدمے کا پہاڑ ہے۔ میرے ماتم میں شریک ہو۔

آتسہ: اے خدائے قہار! تیرے غضب نے میدیوں کو دھوکے میں پھانس دیا۔ شہرہ آفاق اثینیہ نے میرے لخت جگر سے بڑا کڑا انتقام لیا۔ ماراثون کے شہیدوں (کی فہرست) میں اس قتل و قمع کا اضافہ کیا۔ ہائے لخت جگر، نور نظر، جو سرکوبی تو اوروں کی کرنے گیا تھا وہ خود تجھے بھگتنی پڑی۔
مگر (اے پیامبر) یہ تو بتا کہ جو جہاز بچ نکلے تھے وہ تو نے کہاں چھوڑے؟

پیامبر: بیڑے کے باقیماندہ جہاز سالامیس سے تتر بتر ہو کر اندھا دھند بھاگ نکلے بچے کھچے لشکر کی نحیف و زار قطار بیوشیہ کے علاقے سے لیّاں پیّاں گذری۔ وہاں بعض آنکھوں کے سامنے

(سمندر کا) پانی ہوتے ہوئے پیاس سے دم توڑ کے ڈھیر ہوگئے دوسرے تھکے، ہانپتے، گرتے پڑتے علاقۂ نوتیہ اور دوریہ سے گزر کے خلیج میلیہ سے بڑھ کر اس سرزمین میں پہنچے جسے دریائے سفرخیس سیراب کرتا ہوا لوٹ لگاتا ہے۔ پھر بھوک پیاس کے مارے بڑھ کے خطۂ آخیہ کے شہر تھسلی میں پہنچے اور وہاں اکثر بھوک پیاس سے مر گئے۔ راستے بھر ہمیں انہی دو وباؤں سے پالا پڑا۔ آگے نکل کر ہم مغنیشہ اور مقدونیہ میں آئے اور اقیس ندی اور بلبی جھیل کے کنارے پہنچے جہاں نرسلوں کا جنگل ہے۔ پھر ایدونیہ کے میدانوں سے چل کر پنجیانی پہاڑ تک جا پہنچے۔ یہاں کسی دیوتا نے موسم سرما قبل از وقت شروع کر دیا اور پاک دریائے سطرائیمون راتوں رات جم گیا۔ اس مقام پر وہ بھی جنھوں نے بارگاہ خداوندی میں کبھی بندگی نہیں بجائی تھی باری تعالےٰ سے حفاظتِ جان کی بے سود دعائیں مانگنے لگے۔ صرف وہ چند اشخاص بچ نکلے جنھوں نے اس سے پہلے کہ نور کا قادر دیوتا اپنی شعاعیں بھیجے، یخ بستہ ندی پار کر لی۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں روز عالمتاب کے قرص سے کرنوں نے چمک کر ندی کا بندھن کھول دیا اور اس کی تہ میں سے بے پناہ بدبختی نمودار ہوئی۔ (یہ ہوتے ہی) دریا میں ریوڑ کی طرح آدمی پر آدمی گرنے لگا، اور جو پہلے جاں بحق ہوا خوش نصیب رہا۔

ہم چند آفت رسیدہ جو بچے سخت رنج و محن سہتے علاقہ

شراقیہ سے گزر کر رفتہ رفتہ مرز بوم ایران میں پہنچے اور اپنا وطن اور گھر دیکھ پائے۔

شہر اپنے چیدہ نونہالوں کی موت پر جتنا روئے تھوڑا ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا' واقعہ ہے۔ اپنے بیان میں مَیں نے ان آفات میں سے بہت کو چھوڑ دیا جو کسی دیوتا نے ارضِ ایران پر نازل کیں۔

طائفہ : اے خداوند قہار! تیرا ہم پر کتنا قہر تھا کہ تو نے ایرانی قوم کو بے دریغ ٹھوکر سے پامال کر دیا۔

آتسہ : ہائے بدنصیبی! لشکر غارت ہو گیا۔ اے شبِ تار میں آنے والی روحو! تمھاری عیاں پیش گوئی صحیح نکلی۔ مگر اے بزرگو، اگرچہ تمھاری تعبیر گوئی کچھ بھی کام نہ آئی، میں تمھاری صلاح پر عمل کروں گی۔ اب میں جاتی ہوں تاکہ بارگاہ خداوندان میں عجز و نیاز کروں اور ارض (کی دیوی) و ارواح کی خدمات میں نذر گزرانوں۔ ان کی رضا جوئی کے لیے کاک پاک کی نیاز کروں گی۔ جو ہونا تھا ہو لیا۔ اب تو جو آنے والا ہے اس کے لیے دیوتاؤں کی رضا جوئی ضروری ہے۔

بالفعل مجھے اتنا کہنا ہے کہ جو بُرے وقت میں ثابت قدم رہے وہ (خیر خواہ) بڑی نعمت ہے۔ مجھے تمھاری اعانت درکار ہے اگر میرا لختِ جگر میری واپسی سے پہلے آ پہنچے تو رفاقت اور دلجوئی کے لفظوں سے کام لینا اور اس کی (جان کی) خیر پیش نظر رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وفور آلام میں لینے کے دینے پڑ جائیں۔

(چلی جاتی ہے)

طائفہ کا نوحہ: اے برجیس! اے خدائے برجیس! تو نے ہمارے بیشمار لشکر کو جسے بڑا ناز تھا، برباد کر دیا۔ آج ہمارے وہ کثیر تعداد عسکری جو دون کی لیتے تھے کہاں ہیں؟ تو نے سوسہ کی شان اور اکبتانہ کے زعم کو تیرہ و تار الم میں روپوش کر دیا۔ بھری جوانی والیاں اپنے نازک ہاتھوں سے اپنے دوپٹوں کی دھجیاں اُڑا رہی ہیں صدمہ کے چمکتے ہوئے چشموں سے آب شور بہ کر سفید برف سینوں پر برس رہا ہے۔ آج ان کے شوہر کہاں ہیں جن کی کڑیل جوانی کی تازگی پھٹی پڑتی تھی۔ وہ عروسی سیجیں جن کے لالہ رنگ بستر تھے کدھر گئیں اور عیش بھری رنگ رلیاں کیا ہوئیں۔

بشاش زندگی کی مسرتیں ہو چکیں۔ اب آنسوؤں کی جھڑی تھمنا نہیں چاہتی۔

میں نالۂ دل سے ان کا جواب دوں۔ مرثیے کی آواز بلند کروں۔

طائفہ کا مرثیہ۔

طائفہ مقابل: ایشیا کے دور دراز گوشوں میں گریہ و آہ ہے! او لالوں سے بچھڑی نوحہ گر! اردشیر نے چھلاوے کا پیچھا کر کے تجھے تباہی میں ڈالا۔ خیالی پلاؤ کی لگن میں تیری غارت گری کے لیے بیڑہ بادبانوں سے آراستہ کیا۔ دارا ایسا نہ تھا۔ وہ ہیلاس سے جکنا چور نہیں پھرا۔ سوسہ کے اس بے عیب ناوک فگن کا ہم بجا احترام کرتے ہیں۔

طائفہ مقابل: تو نے دیکھا! جہاں کالی رو کار والے جہاز پر تو نے

وسیع سمندر کی شوریدہ موجوں میں راستہ بناتے بڑھ رہے تھے اور جہاں یونانی جہازوں کی چونچیں جھپٹ رہی تھیں۔ وہ جہاز جس میں بیڑے کے بے شمار آدمی سوار تھے دریائے شور کی قبر میں دفن ہو گئے اور ایرانی جہازوں کے مستول ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔

ہمارا پادشاہ اجل سے بمشکل تمام جان بچا کے میدانِ
کارزار چھوڑ کے نکل آیا۔
اور اس غمگین نے شراقیہ کے میدانوں کے (کڑکڑاتے)
جاڑے میں راہ اختیار کی۔

مقابل: ہمارے وہ شہید جو پہلے نذرِ اجل ہوئے یونانی موجوں میں جھکولے کھا رہے ہیں اور اُن بن دفنائی لاشوں پر جو ساحل پر پڑی ہیں کینحرائی سمندر کی موجیں پھر رہی ہیں۔ اس تیز اندوہ کی کاٹ تیرے مغز استخواں تک پہنچنی چاہیے۔ کر! عرش سے ٹکرانے والا نالہ کر۔ یہ وہ عظیم الم ہے جو سینے میں نہ سمائے۔ کر! فلک شگاف فغاں کر!

مدمقابل: وائے میری بدنصیبی!
(ہمارے شہید) سمندر کی بھری ہوئی موجوں میں تھپیڑے
کھا رہے ہیں۔ سمندر کے گونگے نہنگ ان کی تکا بوٹی کر رہے ہیں
بے داغ سمندر کی مخلوق انھیں اس طرح ہڑپ کر رہی ہے کہ
حلیہ تک باقی نہ رہے۔
بے وارث گھر سونے رہ گئے۔ (نامراد) ماں باپ لال
کھو کے ماتم کر رہے ہیں۔ رو رو کے دردانگیز حال سن رہے ہیں۔

مقابل : وائے میری بدبختی! ہم ماتم میں مصروف ہی تھے کہ شوریدہ سروں نے حکومتِ ایران سے سرتابی شروع کردی۔ رعایا میں سے بعض نے آقا کو خراج دینے سے انکار کردیا۔ بعض سجدہ کورنش بجالانے اور زمین ادب کو بوسہ دینے میں تامل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس طاقت کو جو مدتوں تازہ دم اور قوی تھی اب باقی نہیں پاتے۔

مدمقابل : لوگوں کی زبانیں دانش مندی کی لگام سے آزاد، بلند آہنگ شکایات پر اُتر آئیں گی۔ دہانہ اور گردنی سے چھوٹ کے اب یہ غول بے لگام بجواس پر ٹوٹ پڑے گا۔ کیونکہ اب کہیں اُس سمندر شوئیدہ جزیرے کی خوں آشام زمین اپنا شکار اُگلنے والی ہے!

(ان) آنکھوں نے جو دیکھا ہے پھر نہ دیکھیں گی۔

(آتسہ داخل ہوتی ہے)

اے رفقائے باصفا! جو بھی اندوہ (کی حقیقت) کو سمجھتا ہے یہ جانتا ہے کہ جب مصیبت کی موجیں اُمنڈ کے آتی ہیں تو ان پر غور کرتے کرتے کل چیزیں ہراس کے رنگ میں ڈوبی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب خوش بختی کا دریا بے غل وغش بہتا ہے، تو دل میں قوی بھروسہ رہتا ہے کہ نعمتیں عطا کرنے والا خداوند ہمیشہ خوشگوار ہوائیں بھیجتا رہے گا۔

اس سے اندازہ کرلو کہ (آج) میرے دل میں ہول ہی ہول ہے۔ مقدر کا ناقوس کانوں میں بج بج کے فالِ بد کی پیش گوئیاں کررہا ہے اور اندیشہ سے میرے ہوش باختہ ہیں۔

آج نہ شاہی عرابہ ہے، نہ مجھے شاہانہ تزک درکار ہے۔

زردوزی شال میرے موجودہ مقصد کے لیے ناموزوں ہے۔ کیونکہ تم دیکھ رہے ہو کہ میں ارواح کی رضاجوئی کے لیے، یہ سادہ نیاز لے کے آئی ہوں یہ تو اچھوتی گائے کا صحت بخش سفید دودھ ہے اور یہ نتھرا ہوا شہد ہے جو پھول چوسنی مکھی نے مقطر کیا ہے۔ یہ اچھوتے چشمے کا خالص پانی ہے۔ یہ ملاوٹ سے پاک اس انگور کا مفرح شربت ہے جو خودرو ماں (بیل) سے پیدا ہوا تھا۔ اور یہ سدابہار زردی مائل سبز زیتون کا خوشبودار پھل ہے۔ اور یہ گوندھے ہوئے پھول ہیں جو کل پیداوار کی ماں (زمیں) کے لال ہیں۔

مگر میرے عزیز رفیقو! میری یہ درخواست ہے کہ ادھر تو میں دارا ے محترم کی روح کی خدمت میں یہ پاک نذر زمین پر انڈیلتی ہوں اور ادھر آپ لوگ اس دیوتا کی بارگاہ میں دعا اور التجا کریں۔

طائفہ : اے ملت ایرانی کی محترم ملکہ۔ آپ تہ زمین کی اقلیم کو انجلی چڑھائیں اور ہم پاک بھجن شروع کرتے ہیں۔ تاکہ اقلیم ظلمات کے حکمراں دیوتا اپنی عنایت سے ہماری دعا قبول فرمائیں۔

اے مقدس طاقتو! اے تہ زمین کی تاریک کشور شب پر فرماں روائی کرنے والو! اے ارض، اور اے خداوند ہرمنیر! اے سلطان ارواح کہ غیر مجسم پروں پر تیرتا ہے دارا کو عالم منور میں واپس بھیج۔ اگر ہماری مصائب کے بار گراں کا کوئی علاج ہے تو وہ اسے ضرور معلوم ہے۔

مناجات طائفہ۔

مقابل (۱) : اے وہ روح جو سایۂ رحمت میں ہے! میں تیری خداوندی تائید چاہتا ہوں، میری التجا سُن! میں اپنے اندوہ والم کی مختلف ندیاں بہا رہا ہوں۔ میں یہاں تک سرگرم نالہ ہوں گا کہ دیوتا سروپ خسرو ایران تک عالم اسفل میں میری آواز سنائی دے۔

مدمقابل (۱): اے ارض! اور اے ایوان ہائے روحانی کے حکمرانو! اپنے بے نور کاخ سے سوسہ زاد خداوند بزرگ کو بھیجو کہ ایران کی مٹی سے اس سے بڑھ کر کوئی نہیں بنا۔

مقابل (۲): اے محبوب ترین بشر! اے روضۂ پاک! اے خاک پاک جو تیری خاک سے زیادہ عزیز ہے! اے خدائے آئیدوینوس (فرشتۂ قضا) اے سخت گیر آئیدوینوس، اے خداوند جو تیری سپردگی میں ہے رہا کر دے اور بادشاہ دارا کو بہ امان و اطمینان روے زمین پر آنے دے۔

مدمقابل (۲): یہ وہ بادشاہ ہے جس نے کسی ندامت نصیب جنگ میں ہزارہا ہزار کے جیش نہیں کٹوائے۔

اے ایران وہ تیرا رہنماے ایزدی تھا تیرا اصلاح کار تھا، اس کی سپاہ فیروزمند تھی۔

طائفہ مقابل (۳) : اے جلالت مآب آقا تشریف لائیے! بالائے تربت جلوہ گر ہوجیے! تاج شاہی کی کلغی کے قرص اور زعفرانی پاپوش کی تابانی دکھایئے۔ اے پدر مہربان دارا جلوہ افگن ہوجیے۔

مدمقابل (۳) اے آقاؤں کے جلیل القدر آقا جلوہ دیجیے۔ ہمارے

سینہ ہائے فگار کے ہر ے زخم ملاحظہ کیجیے۔ سب سطحی (چشمہ ظلمات یا اجلستان) کی گھٹا نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ ہمارے کل نوجوان ہمیں داغ جدائی دے گئے۔ اے پدر شفیق دارا جلوہ افگن ہو جیے۔

مستزاد۔

واویلا، واویلا، بازواویلا!

وائے آلام و درد

اے آقائے قوی دست تو نے کیوں انتقال فرمایا، کیوں اس سرزمین کو ترک کیا۔ تیرے فرزند نے ایک احمقانہ مہم سے تیری قلمرو کی کیوں بنیادیں ہلادیں۔ ورنہ (آج) ہم اپنے سہ منزلہ جہازوں کا ماتم کرنے پر کیوں مجبور ہوتے۔" اب وہ جہاز' جہاز نہ رہے "

(دارا کی روح تربت پر نمودار ہوتی ہے)

دارا: اے وفا شعار، ثابت قدم رفیقو! اے میرے شباب کے مصاحبو! ایران کے بزرگو! کہو آج مملکت ایران کس حزن گراں میں مبتلائے رنج والم ہے۔ (تمھارے) نالۂ جگر شگاف سے زمین چھد گئی۔ شق ہو گئی۔ میں اپنی رفیق (ملکہ) کو تربت کے پاس دیکھ کے پریشان ہوں۔ ان کی نیاز دلجوئی قبول کرتا ہوں۔ آپ نے ان کی ہمنوائی میں ایسا شور ماتم بپا کیا کہ مُردوں ہادیسؔ[1] (عدم آباد) سے کھینچ لائے۔ نیچے سے اوپر آنا آسان کام نہیں۔ اسفل السافلین کے دیوتا رخصت دینے کے مقابلے میں استقبال کرنے کے لیے زیادہ

---

[1] ہیڈیز (عالم ارواح۔ برزخ)

آمادہ رہتے ہیں۔ مگر میں وہاں بھی فرماں روا ہوں۔ اور تمھارے سوالوں کا جواب دینے آگیا ہوں۔ تمھیں جو کچھ پوچھنا ہو اتنی دیر میں پوچھ لو کہ "وقت" میرے قیام پر معترض نہ ہو۔ ایران کس مصیبت سے جھکا ہوا ہے۔

طائفِ مقابل: (سب مل کر گاتے ہیں)

آپ کے حضور میری زبان نہیں کھلتی۔
آپ کے روبرو (بدن میں) رعشہ ہو گیا۔
آپ کا قدیم رعب طاری ہے۔

دارا: تمھاری آہ و بکا نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ مگر میں عدم آباد کے ایوان چھوڑ کر اس لیے نہیں آیا کہ طولانی گفتگوئیں سنوں بلکہ اس لیے کہ فی الفور جواب مختصر دوں۔ مرعوب نہ ہو اور جو سوال کرنا ہے کرو۔

مدِمقابل: تعمیل ارشاد کرتے ہوئے بھی لرزتا ہوں۔ الم بھی اس قسم کے ہیں کہ آپ کے روبرو اظہار کرنے کا یارا نہیں۔ زبان جواب دے دیتی ہے۔

دارا: چونکہ تم قدیم پاس ادب سے معذور ہو، اور تمھاری زبان نہیں کھلتی، میں (خود) ابتدائے سخن کرتا ہوں۔

اے نجیب الطرفین! اے میری ضعیف العمر، بزرگ سال رفیق خوابگاہ! اپنی گریہ وزاری ختم کر اور مجھے حال سنا کہ کیا بیتا بیتی۔ آفتوں سے واسطہ پڑنا بشر کے حصّے میں آیا ہے۔ اگر مقدر سے عمر لمبی ہو تو یہ مصیبتیں چند ہی نہیں ہوتیں یہ بحری بھی ہوتی ہیں اور برّی بھی (ارضی بھی اور سماوی بھی)

آتسہ : ارے دارا! دورانِ حیات میں کوئی تیرا ہمسر نہیں تھا۔ کسی کو تیری سی شادمانی نصیب نہیں ہوئی۔ تو نے روے زمین پہ خدائی کی۔ ایرانی تجھے قابلِ رشک سمجھتے تھے۔ تو نے آخری دم تک شاداں و فرحاں زندگی بسر کی۔ آج تجھے یہ المِ جانگزا پیش آیا۔ میں چند ہی لفظوں میں سب کچھ کہہ سناؤں گی۔

ایران کا اقتدار ختم ہوگیا۔ فوج غارت ہوگئی۔ سب برباد ہوگیا۔ جو مجھے کہنا تھا، کہہ دیا۔

دارا : کیوں کر؟ کوئی شہر آشوب آیا، یا کسی مکروہ مفسدہ نے سر اُٹھایا۔

آتسہ : نہ یہ، نہ وہ، دور دراز اثینیہ کے قریب لشکر نے شکست کھائی۔

دارا : کس نے کوچ بولا؟ میری اولاد میں سے کس نے فوج کشی کی؟

آتسہ : آپ کے جوشیلے فرزند اردشیر نے۔ اردشیر نے برِّ اعظم کو ابنائے ایشیا سے خالی کر دیا۔

دارا : اس نے یہ احمقانہ مہم پیادہ اختیار کی یا جہازوں پر؟

آتسہ : اس نے دو محاذ قائم کیے۔ ایک برّی، دوسرا بحری!

دارا : مگر کس طرح؟ لشکر اتنا کثیر تھا۔

آتسہ : کمیاب چوب اور آہن ملا کے طوفان خیز آبنائے ہیلیہ (درۂ دانیال) عبور کی گئی۔

دارا : چوب و آہن! کیا ان سے باسفورس کا طغیانی بدوش بہاؤ جکڑا جا سکتا تھا؟

آتسہ : یہی تو ہوا۔ کسی دیوتا نے اُسے گرفتارِ بلا ہونے کا اہتمام کرنے کو یہ روشنی طبع بخشی۔

دارا : حیف! کسی قادر دیوتا نے اس کے ہوش وحواس سلب کر لیے۔
آتسہ : اور اس کی کج فہمی کا خمیازہ اس عدیم المثال وبال میں نمودار ہوا ہے۔
دارا : (خیر) تیری فریاد تو سن لی۔ مجھے اس اتفاق کی تفصیل کو سنا۔
آتسہ : پہلے تو تمام بحری لشکر پر تباہی آئی۔ پھر پیادہ فوج پر وہی آفت ٹوٹی۔
دارا : تو کیا سب ہیلاس کی دشمن (جاں) برچھیوں کا شکار ہوئے؟
آتسہ : قلعہ سوسہ خالی ہوگیا۔ اور اپنے فرزندوں کو رو پیٹ رہا ہے۔
دارا : حیف! اے سپاہ وفا شعار! حیف!
آتسہ : باختر کے کل گلہائے شباب ہلاک ہوگئے۔
دارا : افسوس! میرے خلف بد نصیب! تو نے ہزارہا باوفا رفیقوں کو برباد کر دیا۔
آتسہ : سب شان و شوکت گنوا کے چند تھکے ہارے ہمراہیوں کے ساتھ۔
دارا : ہاں ہاں اس کی کیا خبر ہے؟ بتاؤ بتاؤ۔ میں بہ منت پوچھتا ہوں وہ خود تو امان میں ہے؟ کچھ امید ہے؟
آتسہ : بمشکل جان بچا کے پسپا ہونا ہی غنیمت سمجھا۔ اور اس پل تک پہنچا جو دونوں سرزمینوں کو ملاتا ہے۔
دارا : اور عبور کر کے ایشیا پہنچ گیا؟
آتسہ : یہی۔ خبر تو یہی اڑ رہی ہے۔
دارا : حیف! نوشتہ تقدیر نے کس تیز پروازی سے آلیا۔ اے لخت جگر یہ برجیس اکبر نے تجھ پر آفت نازل کی، میں سوچا کرتا تھا کہ خوفناک پیش گوئی پوری ہوتے ہوتے بڑی مدت لگے گی۔ مگر جب انسان

خود ہی دوڑنے پر آمادہ ہو تو دیوتا اور ایڑ لگا دیتے ہیں چشمۂ الم ہمارے اور ہمارے احبا کے لیے کھلا بہہ رہا ہے۔

میرا فرزند ان باتوں سے بے خبر تھا۔ اس نے نوجوانی کی نادانی اور پُر غرور دلیری سے کام لیا اور خیال کیا کہ آب ہیلی اور ایزدی بحرِ باسفورس کی طغیانی بدوش موجوں کو ایک غلام کی طرح پابندِ سلاسل کیا جا سکتا ہے اور اس کے مغلوب نہ ہونے والے مدوجزر پر پل بندھ سکتا ہے تاکہ ایک عظیم الشان مگر نادان لشکر کے گزرنے کے لیے آئینِ فطرت کے برعکس زبردستی راہ نکالی جائے۔ اس فانی نے غیر فانی پوسائیدون (خدائے بحر) سے متہورانہ طاقت آزمائی کی جرأت کی۔

کیا میرے واژون بخت صاحبزادے کی روح پر زبردست اختلال نہیں چھا گیا تھا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اب وہ تمام دولت جو احتیاط و حزم سے فراہم کی تھی ہر دست دراز کے لیے خوانِ یغما بن جائے گی۔

آتسہ: ناسزاؤں کی صحبت نے تمھارے صاحبزادے کو غلط کاریوں کا سبق دیا۔ انھوں نے اس سے کہا کہ تمھارے پدر بزرگوار کی عالی حوصلگی نے ثروت و حشمت نیزے کی نوک سے پیدا کی تھی۔ تم نامردوں کی طرح محلوں کے زور آزما بن گئے ہو اور اپنے خزانوں میں اضافہ نہیں کرتے۔ ان طعنہ زنیوں سے بدسگالوں نے تمھارے جنگجو کے کان بھرے اور بالآخر ہیلاس کی مہم کا نقشہ بنا کر کھڑا کیا اور (اس طرح) ہماری مصیبتوں اور اس کی بربادی کا

منصوبہ پورا ہو گیا۔

دارا : یہ کر کے میرے لڑکے نے وہ کام انجام دیا جس کی گرانی حافظہ سے محو ہونے والی نہیں۔ کیونکہ خداوند برجیس نے جس دن سے ایشیا کے گلہ بان تاجور کو فرماں روائی بخشی۔ سوسہ کے محلوں میں ایسا سانحہ عظیم بپا نہیں ہوا۔
رعایائے کثیر کا سب سے پہلا شہریار ایک میدی ہوا۔ اس کا لڑکا جانشین ہوا اور اس نے وہ کام جس کا خوبی سے آغاز ہوا تھا بخوبی تمام انجام کو پہنچایا۔ کیونکہ اس زمانے تک اس کی شجاعت کی ناخدا دانشمندی تھی۔ تیسرا جانشین کیروس ہوا۔ جو ایک باثروت (شہریار) تھا اور جس کے دور میں رفیقوں کو امن حاصل رہا۔ اس نے لِدیہ، فرجیہ، اور آیونیہ کو مغلوب کیا۔ اس سے کوئی دیوتا ناخوش نہیں تھا کیونکہ وہ فرزانہ تھا۔ چوتھا تاجدار کیروس کا لڑکا ہوا جو عساکرِ کثیر کا سالارِ اعظم تھا۔ پانچواں ماردوس آیا کہ جو ننگِ ایران و تخت و خاندان ثابت ہوا۔ اسے اردفرنیس نے چند چیدہ وفاشعاروں سے عہد و پیمان کر کے محل کے اندر تہ تیغ کیا۔ اس کے بعد مرافس اور ساتواں اور اردفرنیس ہوا اور اس کے بعد میں نے وہ جاہ و مرتبہ حاصل کیا جو میرے مدنظر تھا۔ میں نے بہت معرکوں میں فوج کشی کی، مگر سوسہ پر کبھی یہ مصیبت میرے واسطے سے نہیں آئی۔
میرا فرزند اردشیر جواں سال ہے اور نوجوانی کے زعم میں چور۔ اس نے میری نصیحت پر کان نہیں دھرا۔ تم میرے ندیم اور

مشیرِ سلطنت رہے ہو اور گواہ ہو کہ ہم نے نقصان اُٹھائے مگر سلطنت کو برقرار رکھا۔

طائفہ: اے آقائے آقایانِ دارا، حضور کا کیا ارشاد ہے۔ ہم گوش برآواز ہیں۔ اب ایران اپنی قوت میں پھر کس طرح تازہ جان ڈالے؟

دارا: اپنی شکست سے سبق لو۔ اگر تمہاری فوج دوگنی بھی ہو تو ہیلاس پر فوج کشی نہ کرنا۔ کیونکہ (وہاں) صرف آدمی ہی نہیں بلکہ (خود) زمین غنیم کا مقابلہ کرتی ہے۔

طائفہ: اس سے آپ کی کیا منشا ہے۔ زمین کس طرح مقابلہ کرتی ہے؟

دارا: اس کے ساحل پر فوجِ گراں بھوکوں مر جاتی ہے۔

طائفہ: مگر تعداد میں اعتدال رہے تو؟

دارا: معتدل تعداد گزارہ کر لے گی مگر اس قلیل تعداد میں سے چند ہی سرزمینِ ایران (دوبارہ) دیکھ پائیں گے۔

طائفہ: کیونکر؟ کیا کل فوج آبنائے ہیلہ پار کر کے یورپ سے نہیں لوٹ آئے گی؟

دارا: اگر دیوتا جھوٹے نہیں، اور وہ پیش گوئیاں جن کا ایک حصہ پورا ہوتا دکھائی دے رہا ہے، مستقبل کے بارے میں سچ ثابت ہوں تو بہتوں میں سے چند (واپس آئیں گے)۔ ایک چیدہ فوج پر انحصار کرنا امید موہوم ہے۔ وہ وہیں رہ جائیں گے جہاں دریائے اسوفس وادیوں کو سیر کرتا ہے اور خود (ان کی لاشیں) اس کی فربہی بڑھا دیں گی۔

بیوشیہ میں بڑی آفتیں ان کا انتظار کر رہی ہیں اور بجا طور سے

کیونکہ ان کے ملحدانہ تکبّر کی یہی پاداش ہے۔ جب وہ یونان میں گھسے تو سرمدی خدایان کی پرستشگاہوں کو لوٹنے اور درگاہوں کو آگ لگانے میں انھیں باک نہ ہوا۔ اور نہ زیارتوں کی قدیم بنیادیں کندہ کرنے، اصنام کو منبروں سے گرانے اور ان کا فرش تک منہدم کرنے میں۔ انھوں نے بڑی غارتگری کی تھی اور ابھی انھیں اس کا بہت کچھ بھگتان بھگتنا ہے۔ آفتیں ان پر اوچھی سوتوں سے نہیں بلکہ تازہ بتازہ اس طرح اُبلیں گی جیسے چشموں کے شراٹے۔ اور دوریہ کی برچھیاں پلاتیہ کی زمین پر خون میں ڈوبی ہوئی لاشوں سے نقش و نگار کھینچیں گی۔ اور کشتوں کے پشتے تین پشتوں تک نظرِ غور کے لیے یہ خاموش عبرت (کا سبق) زبانِ حال سے بیان کریں گے کہ "متکبرانہ دعوے بشر فانی کے لیے نہیں بنے۔ تکبر کے پھول سے اندوہ کا خرمن تیار ہوتا ہے اور حسرت کے پھل دیتا ہے۔" ان باتوں پر غور کرو اور تکبر کی پاداش نگاہ میں رکھو۔ اثینیہ اور ہیلاس کا خیال کرو۔ فراوانی بخشش ایزدی کا کفرانِ نعمت کرتے ہوئے ڈرو، مبادا اِدھر تو چشمِ حرص تازہ عنایات پر جمی رہے اور اُدھر وہ بہت کچھ چھین لیں۔

خداوند برجیس لاف زنی کی سرزنش کرنے والا ہے، اور سرپُر غرور کے لیے اس کا انصاف نہایت گراں ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے جب میرا بدنصیب فرزند واپس آئے تو اس سے شفقت سے پیش آنا اور تادیب کا ایسا پہلو اختیار کرنا کہ وہ ان بے لگام منصوبوں سے درگزرے جو دیوتاؤں کی ناراضی کا باعث ہوئے ہیں اور

اے اردشیر کی پیرانہ سال ماں، تو اندر جا اور ملاقات کے موقع کے لیے ایک شایان شان پوشاک لا۔ کیونکہ عنقریب تو دیکھے گی کہ اس کا زردوزی لباس پارہ پارہ ہو لیا ہے۔ غم کی زردوزی یہی ہے اور کسی طرف متوجہ نہ ہونا۔ صرف شفقت اور عاطفت اندوز الفاظ سے اس کے زخمی دل پر مرہم رکھ سکتی ہو۔

اب میں یہاں سے ظلمات سافلین کو رخصت ہوتا ہوں۔ اے ہمجلیسانِ دیرینہ خیرباد۔ اگرچہ مصائب میں گھرے ہوئے ہو جب تک مہلت باقی ہے، خوشیاں مناؤ۔ موت کے بعد دولت بیکارِ محض ہے۔

طائفہ : ان آلام کی کیفیت سُن کر جو حال اور مستقبل میں ابنائے ایران کو پیش آنے والے ہیں، میں نوحہ گر ہوں۔

خدایا! میری پشت خم کرنے کو مصیبتوں کا اور کتنا بار مجھ پر ڈالا جائے گا! یہ معلوم کر کے میرا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہ میں اپنے شہزادے کو اندوہ سے چور، پوشاک دریدہ محلوں میں آتا ہوا دیکھنے کو زندہ رہوں گی!

چلوں اس کی شان کے قابل لباس لاؤں اور اپنے لال کو حالتِ رنج میں دلجوئی سے تو محروم نہ رکھوں۔

(محل میں چلی جاتی ہے)

مناجات طائفہ

طائفہ مقابل (۱) خوش نصیبی سے جس زمانے میں زمام سلطنت ہمارے خوبیوں کے بزرگ ظل اللہ (جہاندار) دارا کے دست فیروزمند و ظفریاب

میں تھی، مرز بوم ایران کی کیا عظمت و شان تھی اور کشور سوسہ کے مطیع و منقاد بلاد کے لیے کیا روز سعید تھا۔

مد مقابل (۱) بلاد و امصار آئین کے حصار میں (محفوظ) تھے۔ عساکر کے قرب سے ایرانی بے غل و غش تھے۔ شان کھو کے وہ معرکوں سے تھکے ہارے نہیں آتے تھے بلکہ بیش بہا اسباب اور مالِ غنیمت سے لدے پھندے شاداں و نازاں گھر لوٹتے تھے۔

مقابل (۲) کن کن شاندار شہروں نے ان کے آگے سر خم کیا تھا۔ اگرچہ وہ ان سرحدوں سے پار نہیں گئے جو دریائے ہیلی نے میدیوں کے لیے بنا دی ہیں۔ سوسہ سے لے کر شراقیہ تک ان کی جنگ آزمائی کی دھاک تھی اور بحر سطرائیمون کے جزائر کے شہر ان کے ترکشوں کی جھنکار سنتے ہی سرنگوں ہو جاتے تھے۔

مد مقابل (۲) خلیج اور آبنائے سے دور تک اندرون ملک کے بلاد جو برجدار فصیلوں سے کمربستہ تھے، ان کی حکمرانی سے خورسند تھے (اور ان میں وہ شہر بھی شامل ہیں جن کے) غرفہ ہائے سر بفلک کشیدہ جو وسیع عرض دریائے ہیلی کے کنارے، ساحل پر دپونتیس (بحیرۂ مارمورا) کے سینے پر مالا کی طرح جگمگاتے ہیں۔ (یہ وہ مقام ہے) جہاں پونتوس (بحر اسود) کا دہانہ بیٹھی ہوئی آواز سے غرغراتا ہے۔

مقابل (۳) اور وہ جزیرے بھی تو جو ایشیائی ساحل کے سامنے پہرہ داروں کی طرح سینے تانے کھڑے ہیں (یعنی) لیسبوس اور کیوس، جس کے تاکستانوں میں مئے ناب چمکتی ہے۔ اور ساموس جہاں سدا بہار زیتون کے باغیچے لہلہاتے ہیں۔ نیز میقونوس، فاروس اور ناقسوس

جو سمندر میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے بھائی بھائی معلوم ہوتے
ہیں اور جزیرۂ طینوس جس کا پڑوسی جزیرۂ اندروس ہے۔

مد مقابل (۳) اور اُدھر جزیرۂ لیمنوس ہے کہ ایک رُخ ایشیا دوسرا اشراقیہ
کی طرف کیے دو دلا معلوم ہوتا ہے جہاں دیدالوی ایقاروس
(جا کے) گرا تھا۔ جس (واقعہ) کے جزیرہ رودس اور قیندوس گواہ
ہیں اور جزیرۂ قبرص کے چھوٹے بڑے شہر یعنی یاقوس اور سولائی
اس کے (یعنی ایران کے) مطیع ہیں نیز وہ (قدیم) ام سالامیس
جس کی ہمنام دختر ہمارے مصائب کا باعث ہوئی۔

مستزاد

دولت مند یونانی شہروں میں اس کی فرزانہ اور مفید صلاح کا سکہ
چلتا تھا اور شرق کی متحدہ قوتیں ہماری پشت پناہ تھیں کہ ان کی
گوناگوں مسلح افواج دارائے اعظم کی تابع فرمان تھیں۔
مگر اب موج کروٹ لے چکی۔ ہماری مصیبتوں کا سامان (خود) دیوتاؤں
نے کیا اور برچھی بھالوں اور تیز و تند امواجِ بحر نے ایرانیوں کی
طاقت کو برباد کر دیا۔

(اردشیر دور سے)

اردشیر: واویلا! کیسی اچانک ضرب لگی۔ (یہ) تازیانۂ یزدانی جس نے ایران
کو فرش زمین کر دیا، کیسا شدید تھا۔
وامصیبتا!

ے اِدستایا زند میں اشاخشتر لکھا ہے۔

ان سپید (ریش) محترم بزرگوں کو دیکھ کر جو آج جیسے (نحس) روز میرے استقبال کو جمع ہیں، میرے زانوؤں میں رعشہ ہوا جاتا ہے۔
کاش میری قسمت میں ان بہادروں کے ساتھ وہیں جاں بحق ہونا ہوتا جہاں ساحل غربت پر وہ غلطیدہ خون اجل کی تاریکی میں آرام کر رہے ہیں۔

طائفہ: اے لشکر بے قیاس کے شاہ! ہم ان شاہزادوں کا ماتم کرتے ہیں جو آپ کے ہم رکاب تھے۔ اور جو عمائدین ایران کے مایۂ ناز اور سرتاج تھے جنھیں سیف ایزدی نے کاٹ کے رکھ دیا۔ اردشیر نے ہادیس (عدم آباد) کے تیرہ و تار ایوانوں کو ایران کے سرمایۂ ناز سے آباد کر دیا اور وطن اپنے فرزندوں کا نوحہ گر ہے۔ صدہا راہ ظلمات پر گامزن ہوئے۔ ایشیا کے ہزارہا چیدہ غنچہ ہائے (شباب) چند در چند ہزارہا ہزار کماندار راحل قصور تحت الثریٰ ہوئے۔
واحسرتا! واحسرتا! آج وہ شہ زور گرد یل جوان کہاں ہیں۔
اے بادشاہ آج تمام ایشیا آپ کا شریکِ ماتم ہے اور زانوے کمر و رخم کر کے کورنش بجا لاتا ہے۔
(اس موقع پر مشرقی شیون سوز خوانی شروع ہوتا ہے اور سخت شورِ ماتم بپا ہوتا ہے اور سینہ کوبی ہوتی ہے۔ گویا قومی مصائب پر زبردست قومی عزاداری کی جاتی ہے)

طائفہ مقابل (۱): میں ہی ہوں! میں ہی ہوں!
پدر ندامت (غارتگر ناموس)، سرچشمۂ رسوائی۔ گریہ وزاری کرو۔ کبھی میں بادشاہ تھا۔ آج وطن کا ادبار اور قوم کے لیے نحوست

ہوں۔

طائفہ: آپ کے استقبال کو مرثیہ دانی نوحہ گر موجود ہیں۔ ان کی روح فرسا، جانگداز، پُردرد آہ و بکا سنیے۔ سنیے، سنیے پادشاہا، سنیے اور زار و قطار آنسو بہایئے۔

مدمقابل (۱): اردشیر! بلند کرو فغان دلخراش بلند کرو۔ جگر سوز نالہ کرو۔ ملّتِ ایرانی کے کردگار ازل نے کہ جو ہمارے بزرگوں پر برکتیں نازل کرتا تھا، اردشیر کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

طائفہ: ایسا نالہ جو جگر دوز ہو۔
افسانۂ تیرہ بختی دوہرائے۔ کشتگان کا استقبال کرنے والی خونیں بحر کی موجیں یاد دلائے (اور) اس شہر کا نالہ سنیے کہ اپنی اولاد کو رو رہا ہے۔ سنیے! سنیے! پادشاہا سنیے اور زار و قطار آنسو بہایئے۔

مقابل (۲): اردشیر۔ والیٔ برجِ حمل، یونانی غنیم کا حامی تھا۔ اس نے (ہماری سپاہ کو) خشکی پر، اور بھرے جہاز سمندر پر، اپنی درانتی سے کھیتی کی طرح کاٹ ڈالا۔ اور منحوس ساحل پر ہمیں خاک میں ملا دیا۔

سرطائفہ: زاری درد انگیز کرو اور سوال کرو، جواب پاؤ گے۔

طائفہ: وہ انبوہ رفقا جو آپ کے ہمعنان تھا کہاں ہے؟ فرنداق، سوسہ اور پیل وہاں کی زور آوری کیا ہوئی؟ دامتس اور اگداباد، پاشام اور شوشگان کہاں گئے؟ اکبتانہ، (ہمدان) کے محلوں سے عازم سفر ہونے والے سب کہاں ہیں؟

مدمقابل (۲)

اردشیر۔ انھوں نے ایک صُوری جہاز پر سے ایسا غوطہ کھایا کہ پھر غوطہ لگانا نصیب نہ ہوگا۔ سالامیس کے خون آشام سنگلاخ ساحل پر

کشتگان ایسے محو خواب ہیں کہ پھر بیدار نہ ہوں گے۔

وائے برکشتگان! وائے برکشتگان!

سرطائفہ: زاری درد انگیز کرو اور پوچھو جواب پاؤ گے۔

طائفہ: فارنوق کہاں ہے؟ اور کری او مارد کدھر گیا؟ سیوانق کہاں گیا؟ اور عیلیوس عالیجاہ کدھر گیا؟ (والیان) میمفیہ (یعنی) ثاری بیس، مارسیستر، ہست ایکماس اور اردعنبر یہ سب ہیلاس گئے تھے۔ یہ کیا ہوئے۔ کہاں ہیں؟

مقابل طائفہ (۳): دریغا! وامصیبتا!

انھوں نے اثینیۂ پر نظر ڈالی اور نہنگ اجل نے ایک ہی ہڑپ میں لقمہ کر لیا۔ اور ہم انھیں پردیسیوں کے ساحل پر سسکتا اور کراہتا چھوڑ کے آگئے۔

طائفہ: کیا آپ نے اپنے نور چشم باوفا فرزند بطنوقس کو بھی وہیں پڑا چھوڑا؟ کیا آپ نے اس کو بھی سالامیس کے ساحل پر چھوڑا جو آپ کے بیسیوں دہ ہزاریوں کا سردار تھا۔ عوبیرث اور فارطوث کو بھی دشمن موجوں کے تھپیڑوں کے حوالے کر آئے؟

دریغا! دریغا! دریغا!

کیا شاہزادگان پارس کو طغیانی افزا بحر اور دشمن کے حوالے کر آئے؟

مدمقابل (۳): واویلا! واویلا!

تمھاری فغان تیز میرے مغز استخواں تک چبھ رہی ہے۔ میرا دل تمھاری آواز کو چیخ چیخ کے پکارتا ہے۔

(ہاں) میرے نہایت محبوب دوستوں کے نام گنواؤ۔

طائفہ: ایک اور نام ہے جس کا صدمہ میرا دل مسوستا ہے۔
مردیانی قوم کا امیر زانطس (نیز) اتکاریس مردِ میدان اور صبا رفتار شہسوار دیا افسیس اور ارساق جو اشوپتی یا امرائے اسپ تھے۔
کہاں گئے؟
لائی سیمنہ، کیقباد اور تلمن جو رزم کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تو نہیں کہ وہ آپ کی رتھ کے پیچھے ہوں جس پر چھتر ہے۔

مقابل (۴): اردشیر۔ وہ راہی عدم ہوئے، کُل سالار ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے۔

طائفہ: ایسے گم ہوئے کہ اب اُن کی خبر نہ آئے گی۔

اردشیر: ہیہات! ماتم سخت ہے!

طائفہ: اے خداوندو تم نے آلام کی بلندی پر ہمیں منظر عام بنایا اور آطے (فرشتۂ قضا) اس جانستاں نمایش سے اپنی آنکھوں کی مدارات کر رہا ہے۔

مدمقابل (۴): ہم بلا رسیدہ ہیں۔ بلا بھی وہ جس کا درماں نہیں۔ یہ بلائے آسمانی ہے۔ یہ آفت انتقامی ہے۔ اور نہایت ہولناک۔

طائفہ: وہ روز نحس تھا کہ ہم نے شجاع یونانیوں سے جنگ ٹھانی۔ یونانی جہازوں نے ایران کو پورا گہن لگا دیا۔

مقابل (۵): اردشیر۔ یہ کچھ فوج فرا ہوتے ہوئے کیا ضرب کاری لگی۔

طائفہ: کیا عظیم الشان طاقت تھی! ایران کی طاقت خاک میں مل گئی۔

اردشیر: میری ساری مملکت کا بقیہ یہ رخت دریدہ دیکھو!
طائفہ: دریغا! ہم دیکھ رہے ہیں۔
اردشیر: یہ خانۂ تیر۔ یہ خالی ترکش دیکھتے ہو!
طائفہ: آپ کیا فرما رہے ہیں۔ خالی یہ ترکش؟
اردشیر: بس لے دے کے یہ ترکش باقی بچا ہے۔
طائفہ: ساز و سامان گراں مقدار میں سے کیا ہیچ شے باقی رہی!
اردشیر: (میں) بے یار و مددگار رہ گیا۔
طائفہ: (مگر) قوم یونان نیزہ سے مُنہ نہیں موڑتی؟

مدمقابل (۵)

اردشیر۔ وہ اس کا خوب مقابلہ کرتے ہیں۔ میں نے جانستاں ہنگامۂ کارزار دیکھا ہے۔
طائفہ: آپ نے بحری ہنگامہ اور فراری بھی ملاحظہ کی؟
اردشیر: ہاں! اور اسے دیکھتے ہی جامہ چاک کیا۔
طائفہ: واویلا! واویلا!
اردشیر: یہ الم واویلا سے بڑھ کر ہے اور بدترین سے بھی بدتر ہے۔
طائفہ: دوبالا وسہ بالا برگشتگیٔ تقدیر۔
اردشیر: ہمارے لیے تازیانہ اور یونانیوں کے لیے شادیانہ۔ (ہمارے لیے رنج اور یونانیوں کے لیے راحت)
طائفہ: ہماری قوتِ بازو ٹوٹ گئی۔ اور ہماری طاقت جواب دے گئی۔
اردشیر: نہ جنازہ نہ فاتحہ۔
طائفہ: دریغا! تیرے ہمجلیس سالامیس میں کھیت رہے۔

طائفہ مقابل (۶)

اردشیر: گریہ وزاری کرو اور آب شور بہاتے محل چلو۔

طائفہ: ہم زار و قطار رو رہے ہیں اور آب شور بہاتے آپ کے ہمراہ محل چلتے ہیں۔

اردشیر: شور جرس تیز کرو!

طائفہ: داغ پر داغ ستم ہے۔

اردشیر: نالۂ جرس بلند تر کرو!
واویلا میرے حسبِ منشا کرو۔

طائفہ: ضرب وزنی اور کاری لگی۔

اردشیر: میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔

مدمقابل (۶)

اردشیر: ہاتھوں سے دھڑا دھڑ ماتم کرو۔ غم کے چپوؤں سے الم کی کشتی کھیئو۔

طائفہ: ہم ہاتھوں سے سینے پیٹ رہے ہیں۔ اور تیرہ بختی کو رو رہے ہیں۔
الم کی ناؤ غم کے چپوؤں سے کھے رہے ہیں۔

اردشیر: نالۂ جرس تیز تر کرو۔

طائفہ: داغ پر داغ ستم ہے۔

اردشیر: نوحہ درد، تیز تر بلند کرو۔
واویلا میرے حسبِ منشا کرو۔

طائفہ: پرجوش نوحہ درد ہم تیز تر بلند تر کر رہے ہیں۔ نالہ آپ کی حسبِ منشا کر رہے ہیں۔

اردشیر: آہ سرد پر آہ سرد۔
طائفہ: نوحہ پہ نوحہ نالہ پہ نالہ

مقابل (۷)

اردشیر: چھاتی پیٹو۔
مائیشیہ کے نوحہ گروں کے ماتم کی طرح طغیانی بڑھنے دو۔
طائفہ: مائیشی ماتم کی طرح، ہاں ہاں مائیشی مرثیہ کی طرح۔
اردشیر: اپنی عزّت کی علامت (یعنی) سفید برف ریش کو منہ پر سے نوچ پھینکو!
طائفہ: نوچ رہے ہیں۔ اپنی سفید برف ریش نوچ رہے ہیں۔
اردشیر: نالہ وفغاں پھر جوش سے بلند کرو۔
طائفہ: بار بار نالہ بلند ہو رہا ہے۔

مدمقابل (۷)

اردشیر: (یہ) جامۂ سفید سینے پر سے چاک کرو۔ (اور) اپنے دلہائے فگار دکھاؤ۔
طائفہ: لیجیے ہم نے جامۂ پاک چاک کر ڈالا۔
اردشیر: اپنے سروں کا بزرگی کا نشان نوچ ڈالو۔ اور سر بے مو (پیٹ کر) اپنے کشتگان کا ماتم کرو۔
طائفہ: میں اپنے بال نوچے پھینکتا ہوں۔ اور اپنے کشتوں کے لیے اشکبار ہوں۔
اردشیر: روؤ، روؤ، یہاں تک روؤ کہ آنکھیں دھندلی ہو جائیں۔
طائفہ: ہماری آنکھیں سیل اشک میں تیر رہی ہیں۔
اردشیر: نالۂ جرس تیز تر بلند کرو۔

طائفہ : داغ پر داغ ستم ہے۔
اردشیر : رنجیدہ دل لے کے محل کو چلو۔
طائفہ : ہم قدم اُٹھا رہے ہیں۔ اور یقیناً عالمِ مسرّت میں نہیں۔
اردشیر : شہر غم سے گونج اٹھنا چاہیے۔
طائفہ : کوچہ و بازار سے نوحے کی آواز آئے۔
اردشیر : "نازک قدم" فرزندان سوسہ، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاؤ۔
طائفہ : ہم زمینِ غم کاشتہ پر آہستہ آہستہ قدم دھر رہے ہیں۔
اردشیر : جزیرہ ایاقس کے جہازوں نے ہمیں بالکل غارت کر دیا۔ ہاں اِن ہی جہازوں، سہ عرشہ جہازوں نے۔
طائفہ : رخصت ہوجئے۔ اشک آپ کا عناں گیر ہو۔

(چلے جاتے ہیں)

ڈرامہ

پارسی

(ب)

نظم

پارسی

پیش خواناں

ہم وہ ہیں اونچا ہے جن سے کشورِ جم کا نشاں
کاخِ زرّیں کے محافظ، ایشیا کے پاسباں
ساحلِ ہیلاس پر یورش کا جب ساماں کیا
شہریارِ سوس نے ہم سب کو یہ فرماں دیا
تم بزرگانِ دیارِ سوسہ و ایران ہو
بلکہ تم میرے مشیرِ خاص اور ارکان ہو
ق ۔ لوٹ کر جب تک نہ آئیں فتحمندان جری
ہو نہ جب تک مرغزارِ سوس میں پھر واپسی
ہم تمھارے ہاتھ میں دیتے ہیں ایراں کی زمام
ہے تمھارے ذمّے ساری سلطنت کا انتظام
ایشیا اور کشورِ ایراں کے ہو تم مرزباں
واپسی تک ہاتھ میں رکھو حکومت کی عناں

دل مرا بے چین رہتا ہے خیالِ شاہ سے
کیا کہوں، میں مضطرب ہوں اک شکِ جانکاہ سے
دل میں میرے بیش گو تاریکیاں ہیں وہم کی
وسوسوں کی گویا ہیں پرچھائیاں سی بھر رہی
یعنی جس دن سے سدھارا شہریارِ نوجواں
ایشیا سے ساتھ لے کر ایک فوجِ بیکراں
کی تھیں جن کی معرکہ آرائی کی تیاریاں
دوش پر جن کے سجے تھے ترکش و تیر و کماں
مجھ کو رہ رہ کر خیال آتا ہے شاہنشاہ کا
لشکرِ جرار، اور فوجِ شہِ جمجاہ کا
فکر دامنگیر ہے، دل میں پریشانی ہے یوں
شہ سوار و پیک و قاصد آج تک آئے نہ کیوں
کیوں نہیں پہنچی خبر آخر کوئی ایواں تلک
کوئی تو آتی خبر اُڑتی اُڑاتی یاں تلک
ق۔ وہ بھی کیا دن تھا کہ سربازانِ سوس و ایشیا
اکتبانہ اور ارکِ سوس کے سب سورما
لشکرِ بحری و برّی، پیدل اور گھوڑے سوار
مل کے سب اک عسکرِ جرّار و فوجِ بے شمار
صف بہ صف آراستہ، ترتیب و نظمِ جنگ سے
نکلے تھے کس آن سے، کس شان، کس آہنگ سے

آمستر اور اردفیریں فوج کے سالار تھے
میگبات اور آرتاسپ نائب سردار تھے
دور اور نزدیک کے سرخیل اور فرمانروا
مرزباں سب دولت ایراں کے اور خشتر پا
حسب فرمان شہنشاہی تھے سب حاضر ہوئے
سب کمر بستہ تھے، اور پُرجوش عازم جنگ کے
دید کے قابل تھی شانِ عسکری اس فوج کی
گونجتی تھی گوشِ ساحل میں صدا اُس موج کی
ان شجاعوں میں تھا وہ اردعنبر پیکار جو
ہوتا زہرہ بے جگر کا آب جس کے روبرو
استقامت کی زرہ میں غرق وہ عالی وقار
مرکبِ تازی کا دلدادہ تھا ہمّت کا سوار
دوسرا تھا آمیوشس بے بدل جویاے جنگ
بیٹھتا تھا دشمنوں کے دل پر جس کا ہر خدنگ
سیدراں، ماسیدر، دیگر فرندق پہلواں
تازیانے جن کے تھے جیسے کڑکتی بجلیاں
بیٹھ کر جس دم ارابوں پر وہ ہوتے تھے رواں
دید کے قابل تھا ان کی اسپ رانی کا سماں
جیش آئے تھے کئی اس سرزمیں میں مصر سے
جو عظیم الشان رودِ نیل سے سیراب تھے

سوسکان و مصر کے لشکر میں تھے جو جنگجو
ان کا تھا سالار اک پاگستہ گوں پیکار جو
جیش ان میں ایک مترا ضان لیمفس کا بھی تھا
زاہدانِ مصر کا تھا آرسامی ناخدا
سرفروش آئے تھے کچھ طیبس کے فرزند بھی
تحت میں تھی فوج جن کی آریو مردوس کی
دلدلی جھیلوں کے باشندوں کی بھی اک فوج تھی
جن کے لمبے چپوؤں سے سرنگوں ہر موج تھی
تھے یہ وہ بے باک کشتی راں کنارِ نیل کے
تھا محیطِ بیکراں جن کو مثال اک جھیل کے
ساکنانِ لِڈیہ کو لشکر پہ اپنے ناز تھا
کروفر سے کوچ کرنا ان کا خاص انداز تھا
ان عساکر پہ قبیلوں کے جو آئے دور سے
افسرانِ ارگنتس اور مترگُس مامور تھے
حکمراں سب شاہِ ایراں کے تھے منقاد و مطیع
ایشیا سے مصر تک دامانِ ایراں تھا وسیع
ساردیس زرفشاں کے معرکہ آرا بھی تھے
پہیوں میں جن کے رتھوں کے تیز خنجر تھے جڑے
ان رتھوں میں جوڑیاں جُتتی تھیں دو دو تین تین
سہمتا تھا آسماں اور لرزی جاتی تھی زمین

ساکنان سارہیس اور کوہساری مار دول
سینے میں رکھتے تھے شوق رزم کچھ حد سے فزوں
دل ہیں ان کے جوش زن ہے درحقیقت بس یہ شوق
ڈال دیں اک مرتبہ یونان کی گردن میں طوق
چوڑے سینے ان کے سنداں ہیں سناں کے سامنے
چھاتیاں خود ڈھال ہیں تیر و کماں کے سامنے
ہیں شریکِ معرکہ مائیشیہ کے سرفروش
تیر اندازی کا جن کے دل میں ہے جوش و خروش
وہ بھی آئے تھے جو ہیں طوفانی موجوں کے سوار
جن کی نظروں میں ہے ہر طوفان قلزم راہوار
آیا تھا زرّین بابل سے بھی اک جمِّ غفیر
وہ کماں زہ کرنے والے، ماہرانِ جنگِ تیر
ہمعنانِ خاص شاہنشہ کے ہیں وہ نوجواں
ایشیا کے دور ملکوں سے جو آئے تھے یہاں
نیمچوں سے رہتی ہے آراستہ، جن کی کمر
بے تامّل یہ دلاور کھیلتے ہیں جان پر
اس مہم میں نونہالانِ وطن ہیں بیش بیش
پھول وہ چوٹی کے ہیں اور خاورِ ایراں کے خویش
گو وہ جن میں چڑھے پروان، سونی رہ گئی
وہ سدھارے رن کو ماں تکتی کی تکتی رہ گئی

گن رہی ہیں مائیں بہنیں سخت گھڑیاں رات دن
راہ تکتے کٹتی ہیں کمبخت گھڑیاں رات دن
نازنینانِ وطن، وہ ان کی مہوش بیویاں
جھیلتی ہیں ہول میں بیم و رجا کی سختیاں
"دیکھیے!" ہر ایک کہتا ہے "زمانہ کیا دکھائے"
"کیا خبر ہے کیا زمانے کے شکم سے پیش آئے"

سطر و فی متقابل (۱): وہ لشکرِ جرار کرے جو تہ و بالا
ہر جنگ کے میدان کو پڑ جائے جو پالا
جو زیر و زبر کرتا ہے امصارِ جہاں کو
اک کھیل سمجھتا ہے جو ہر بازیِ جاں کو
اب قلزم مغرور کے طوفاں سے گزر کر
وہ ساحلِ ہیلاس پہ جا پہنچا ہے لشکر
تیار ہوا شاہ کے فرمان سے معبر
پابند کیا بند و سلاسل میں سمندر
سنگم پہ جو بحرین کے پل باندھا گیا تھا
گردن پہ تلاطم کے وہ تختوں کا جُوا تھا
گذری ہے درہِ ہیلیہ سے فوج ظفر موج
میدانوں میں یونان کے ہے خیمہ زن اب فوج

برعکس سطر و فی مدمتقابل (۲): ایران کے جانبازوں کا وہ مایۂ صد ناز
یونان کی افواج کا وہ خانہ بر انداز

ہیلاس میں نقّارے بجاتا ہوا پہنچا
وہ پرچمِ فیروزی اڑاتا ہوا پہنچا
سرتاج عساکر کا جو ہیں گنتی سے باہر
گلّوں کا نگہبان جو انجم سے ہیں بڑھ کر
ہے اس کے سوار اور پیادوں کا وہ لشکر
مانند نہیں جس کے کہیں روے زمیں پر
ہیں زیب تن ہر اک کے زرہ بکتر و خفتان
نازاں ہے اُدھر فوج اِدھر آن پہ یہ نازاں
ہے ملّت زرّیں کی یہ آنکھوں کا ستارا
یعنی یہ چراغ سر عالم ہے ہمارا
یہ ملّتِ ایران کا ہے راج دلارا
ایران کے افلاک کا رخشندہ ستارا
سوسہ کا صف آرا ہے وہ پیکار کا شاطر
جو معرکۂ برّی و بحری کا ہے ماہر
گو فانی نہادوں میں ہے یہ صاحب افسر
ہے زندۂ جاوید خداؤں کا یہ افسر

مقابل (۲) : دیکھو تو ذرا ! چشم کا وہ شعلۂ شہلا
جو آنکھ میں اژدرہی کے پائے گا دہکتا
مانندِ حمل دوش پہ ترکش ہے کماں ہے
سریانی ارابہ میں رواں شاہ کیاں ہے

خود قلب میں اور چاروں طرف فوج صف آرا
محشر ہو بپا اس کا جو ہو جائے اشارا
سب نیزہ فگن گرد ہیں، یہ اُن میں گھرا ہے
سورج کی طرح اپنی ہی کرنوں میں چھپا ہے

مدمقابل (۲): اب دیکھیے کیا آگے دکھائے گا مقدّر
ہر سمت سے یونانی جب آئیں گے اُمنڈ کر
موجوں کی طرح وادی و صحرا میں وہ ہوں گے
طوفاں کے سے، بپھرے ہوئے قلزم کے تھپیڑے
پھر دیکھنا ہے پلّہ کدھر جا کے جھکے گا
پھر دیکھنا ہے کون وہاں بھاری پڑے گا
ہے کون جو ایرانی دلیروں کے مقابل
شمشیر زنی کا کبھی ہو گا متحمل
نوبت جو کبھی آ گئی شمشیر زنی کی
ہو جائے گی خاک آبرو ناوک فگنی کی

مستزاد: دیوتاؤں کے اگر ہوتا ہے کچھ پیش نظر — پیشتر سے پیشتر
ڈال دیتے ہیں وہ پردہ فانیوں کی آنکھ پر — تا نہ ہو ان کو خبر
دام سے ان کے نکل جائے بھلا کس کی مجال — ان سے بچنا ہے محال
کس کی ہستی ہے کہ لائے بچ نکلنے کا خیال — بے اماں ہے ان کا جال
بڑھتے ہیں وہ مسکراتے، جال پھیلاتے ہوئے — صاف بہلاتے ہوئے
مثل گیسو پیچ و خم میں اپنے لہراتے ہوئے — بل پہ بل کھاتے ہوئے

مقابل (۳)

ایران! مقدّر میں ترے امن کہاں ہے
قسمت میں تری جنگ وجدل، تیر وکماں ہے
آتی ہے فلک سے بھی یہی غیب کی آواز
تقدیر میں غارتگری ہے یا ہے تگ و تاز
ہے تیغ وسناں، اسپ وعناں سے ترا رشتہ
ہے تاخت و تاراج نصیبوں کا نوشتہ

مدمقابل:

دریا کا دہانہ تھا جہاں جھاگوں سے لبریز
ایک شورِ تلاطم تھا جہاں غلغلہ انگیز
غرّانے کی آواز جہاں تند ہوا کی
تھی بحر کی آواز غضبناک کی شاکی
تھیں باد کے غرّانے پہ قلزم کی دھاڑیں
آواز جوابی کی کڑک کی تھیں یہ باڑیں
طوفان تھا واں قلزم موّاج کا ایسا
دل جس سے دھڑکتا تھا، کلیجہ تھا دہلتا
معبر وہاں تیار ہوا حکم سے شہ کے
رسّوں سے جکڑ بند کیے تختوں کے پشتے
بس تختہ ہی کا پردہ تھا راہی و اجل میں
ایک لغزشِ پا پار لگا دیتی تھی پل میں
اس پل پہ سے کل لشکرِ جرّار گزارا
بحرِ متلاطم سے اسے پار اُتارا

مقابل (۴) اس وسوسے نے ایسا مجھے گھیر لیا ہے
پردہ سا مری روح پہ اک ڈال دیا ہے

مدمقابل (۴) یہ خوف ہی تو خار سا ہے دل میں کھٹکتا
اس ڈر ہی کا انگارہ ہے سینے میں دہکتا
آواز مرے کان میں ایزد نہ یہ ڈالے
"واحسرتا! اے سوسہ! کہ عسکر کے ہیں لالے"
"صد حیف! کہ اب لشکر ایراں نہیں باقی"
"واحسرتا! آغوش ترا رہ گیا خالی"
"افسوس کہ یوں رہ گئی سنسان یہ بستی"
"صد حیف! کہ ہو حق کا ہے میدان یہ بستی"

مقابل (۵) اللہ نہ کرے کانوں میں آواز یہ آئے
یہ نوحہ خدا سوس میں ہم کو نہ سنائے
میں عورتوں کے ماتم وزاری کو نہ دیکھوں
اور چاک گریباں کسی پیاری کو نہ دیکھوں
زربفت کی پوشاکوں کو دیکھوں نہ کبھی چاک
اللہ نہ کرے ڈالیں سروں پہ وہ کبھی خاک

مدمقابل (۵) لشکر جو گئے شاہ کے ہمراہ وہ سارے
تھے ٹڈیوں کے دل سے، مہاوں کے سے چھتے
ایک مجمعِ بحرین پہ پل ایسا بنایا
قلزم نے جسے شوق سے آنکھوں پہ بٹھایا

تھا ایشیا اس پار، تو یونان تھا اُس پار
دو ساحلوں کے دوش پر اس پل کا رہا بار

مقابل (۶) ایران کی سب حور وشیں ہجر سے مضطر
تر آنسوؤں سے کرتی ہیں بالین معطر
دن کاٹتی ہیں حسرت و حرماں میں یہ غمگیں
ارمان و تمنّا کا ہے مجمع سرِ بالیں
بالم کہیں بلّم لیے ہیں بادیہ پیما
اور گھر میں یہاں ہجر ہے اور عشق کا سودا

پیش خوانان : آؤ ایرانی بزرگوں اب ذرا شوریٰ کریں
دولتِ ایران کے اس قصرِ عالیشان میں
ق۔ شاہ ظل اللہ، وہ دلبند دارا، اردشیر
وہ جری، ذی عزم و عظمت، وہ دلیروں کا دلیر
خوں ہمارا، دودمانِ کے کا وہ چشم و چراغ
نام روشن ہے ہمارا جس سے وہ عالی دماغ
معرکہ آرا ہوا ہے خطۂ ہیلاس میں
آؤ ہم اس جنگ کی حالت کا اندازہ کریں
رزم کے انجام پر ڈالیں نگاہِ دوربیں
آؤ سوچیں پیش آیا کس کو روزِ واپسیں
مایۂ نازش ہے ناوک عسکر ایران کا
جیسا پیکانِ سناں ہے لشکر یونان کا

طرۂ فیروز مندی کس کے حصّے میں رہا؟
تیرِ پرّاں کے کہ پیکانِ سناں کے سر بندھا؟
ہاں ذرا ٹھیرو

وہ دیکھو کون آتا ہے ادھر
اے لو! یہ تو حضرت علیا ہوئی ہیں جلوہ گر
مثلِ چشمِ ایزدی روشن سراپا نور ہیں
رونق آذر ہیں، گویا پرتوِ آہور ہیں
آج وہ تشریف لاتی ہیں یہاں دربار میں
کورنش اور سجدۂ آداب لازم ہے ہمیں

ملکہ آتسہ سے مخاطب ہو کر:

اے بزرگیِ سراپا، اے وقارِ عزّ و شاں!
کورنش کیجے قبول اے بانوے شاہ جہاں!
آیئے تاجِ خواتینِ زمانہ آیئے
آیئے عصمت پناہِ اکتبانہ آیئے
اُس جلیل القدر کی بیگم جو تھا اک دیوتا
اُس عظیم الشان کی ماں جو دیوتا ہے آج کا
ہے دُعا قائم رہے ایران کا عزّ و وقار
اور مستحکم رہے دائم ہمارا اقتدار
روزِ اوّل سے شجاع ایران کے ہیں ارجمند
لطفِ یزداں سے انھیں پہنچی نہیں اب تک گزند

شاد کامی ہی سدا ان کے مقدر میں رہے
خلعتِ فیروز مندی ہی سدا بر میں رہے

آتسہ تزک و احتشام سے ارابۂ شاہی پر سوار داخل ہوتی ہے۔

آتسہ : قصرِ زرّیں بارگاہِ خاص سے آئی ہوں میں
یعنی اپنی خوابگاہِ خاص سے آئی ہوں میں
اس شبستاں میں کبھی باہم تھے دارا اور میں
قصرِ زرّیں میں تھا وہ اور رنگ آرا اور میں
بات چھوٹی سی نہیں، میں جو یہاں تک آگئی
پھانس سی دل میں کھٹکتی ہے مرے اک وہم کی
وسوسوں کو دل کے ظاہر کرنے آئی ہوں یہاں
سینے میں اندیشوں کو آخر رکھوں کب تک نہاں
گھیر رکھا ہے مجھے وہموں نے آخر کیا کروں!
مشورہ کرنے رفیقوں سے یہاں تک آئی ہوں
دل میں کہتی ہوں خدا ناخواستہ ایسا نہ ہو
فتنۂ تازہ تکبّر کا کہیں پیدا نہ ہو
ہے غرورِ جاہ و حشمت ایسا انساں کا عدو
لمحہ بھر میں خاک کر دیتا ہے عیش و آبرو
مجھ کو یہ ڈر ہے وہ گنج شائیگاں ایران کا
لطفِ یزداں سے کبھی دارا نے جو پیدا کیا
نذر ہو جائے نہ سب خصمِ تکبّر کے کہیں
اس بلا سے دولت و حشمت کبھی بچتی نہیں

دل میں میرے وہم دوسرا ہے ذرا اس کو سنو
میری سُن کر جو سمجھ میں آئے وہ مجھ سے کہو
دل میں کرتی ہوں کبھی میں اس حقیقت پر نظر
مال ہے کس کام کا جب مرد سے خالی ہو گھر
سلطنت دولت سے خالی ہو تو وہ کس کام کی
گھر اندھیرا ہے نہ ہو گر روشنی آرام کی
کانپ اُٹھتی ہوں جب آجاتا ہے مجھ کو یہ خیال
آنکھ کا اور گھر کا یکساں ہے زمانے بھر میں حال
چشم کا خانہ ہے خالی نور اگر اس میں نہیں
سمجھو گھر خالی اگر آقا نہ ہو اس میں مکیں
مملکت کے معتمد دانا ہو فرزانہ ہو تم
گیسوے فرزانگی کے واقعی شانہ ہو تم
کل فراست اور دانائی ہے تم پر منحصر
دور بیں ہو دور اندیشانہ رکھتے ہو نظر
سُن لیے میرے وساوس اور مرے وہم وگماں
میری خاطر کی پریشانی کی سُن لی داستاں
استفادہ چاہتی ہوں اب تمھاری پند سے
تاکہ میرے دل سے نکلیں سارے وہم اور وسوسے

پیش خوانان:

شہر بانو! ہم اطاعت کے لیے موجود ہیں
ہر عمل اور مشورے کے واسطے موجود ہیں

ہم حدِ مقدور تک فرماں بجا لائیں گے سب
جاں نثاری پر کمربستہ یہاں پائیں گے سب

آتسہ: سُنیے! جس دن سے سدھارا ہے مرا لختِ جگر
دیکھتی رہتی ہوں میں خوابِ پریشاں رات بھر
پیش آئی ہے مہم جس روز سے یونان کی
مانگتی ہوں خیر ہر لحظہ شہِ ایران کی
خواب یوں تو دیکھتی ہوں روز لیکن کل کی شب
جو بھی دیکھا صاف تھا میرے تکدر کا سبب
دیکھتی کیا ہوں کھڑی ہیں سامنے دو مورتیں
قد میانہ سے کچھ اونچا، پیاری پیاری صورتیں
حُسن تھا بے عیب ان کا، حور کے مانند تھیں
سرو قد، مہ رخ، شعاعِ نور کے مانند تھیں
زیب تن تھی ایک کے پوشاک ہیلانی تمام
دوسری پہنے ہوئے ملبوس دورانی تمام
رہنے والی ایشیا کی یہ، تو یونانی تھی وہ
یہ اگر تھی ماہرو، صورت کی نورانی تھی وہ
تھیں قبائیں زرق برق اور فاخرہ ان کا لباس
ایک گھرانے کی یہ دو بہنیں کھڑی تھیں پاس پاس
دونوں کی آپس میں لیکن اس قدر تکرار تھی
ایک کی صورت سے بالکل دوسری بیزار تھی

دیکھا شاہنشاہ نے آپس میں جو لڑتا ہوا
دونوں کی گردن پہ اپنی رتھ کا شاخہ دھر دیا
ایک نے شاہی عنان پڑتے ہی سر اونچا کیا
گویا شاہی رتھ میں جُت جانے پہ اس کو ناز تھا
دوسری نے لاتیں پھینکیں، کودی، اُچھلی، اڑ گئی
توڑ بم، باگیں تڑا، رتھ پھینک کے چلتی بنی
آ رہا لختِ جگر میرا یکایک خاک پر
آن پہنچے حضرت دارا یہ حالت دیکھ کر
جامۂ تن چاک کر ڈالا شہِ ایران نے
یعنی میرے نور دیدہ، شاہِ والاشان نے
شب یہ دیکھا خواب اور لائی سحر اک فالِ بد
پیش جو آیا مجھے، سُنیے ذرا وہ حالِ بد
جاگتے ہی نذر مانی مرکزِ اُمید کی
خاورِ افلاک یعنی حضرتِ خورشید کی
چشمۂ اطہر کے آبِ پاک سے کر کے وضو
بارگاہِ خور کی جانب میں نے پھیرا اپنا رو
ہاتھ میں لے کر چلی گھر سے نیازِ آفتاب
اتنے ہی میں اس طرف سے اُڑ آیا آیا اک عقاب
میں تو اس کو دیکھ کر گم سم سی ڈر کر رہ گئی
دل میں سوچا دیکھیے تقدیر کیا دکھلائے گی

دیکھتے ہی دیکھتے آ پہنچا پھر اک باز بھی
اور چنگل مار کے شاہیں کی کلغی نوچ لی
طائروں کا شاہ چپ تاج اپنا نچوایا کیا
سرنگوں تھا شاہباز، اور باز پَر نوچا کیا
دیکھ کر یہ حال مجھ پر خوف طاری ہو گیا
وہ اثر تم پر ہے سُن کر، جو اثر مجھ پر ہوا
یوں تو مستحکم تسلّط شہ کا ہے ایران میں
اس مہم سے فرق کیا ہوتا ہے ان کی شان میں
چشمِ ما روشن، اگر فیروز مند آئیں وہ گھر
سوس میں آکر وہ کھولیں شان وشوکت سے کمر
ہے یہاں دائم سلامت ان کا اقبال بلند
یعنی اپنے گھر میں وہ ہر حال میں ہیں ارجمند
باز پرس ان سے کرے کوئی، یہ ہے کس کی مجال
فالِ بد اور خواب سے ہوں میں مگر آشفتہ حال

پیش خوانان : مادرِ مشفق! ذرا سُنیے ہماری التماس
اس میں جرأت لاف کی ہے اور نہ اندازِ ہراس
ہے ادب سے عرض اب کیجے دعا پر انحصار
کیجیے روے نیایش جانب پروردگار
فالِ بد کا دفع کرنا ہے خداوندوں کے ہاتھ
اپنے بندوں کا وہی دکھ درد میں دیتے ہیں ساتھ

کیجیے منّت سماجت حضرت دادار کی
کھولتے ہیں وہ گرہ ہر عقدۂ دشوار کی
سود اور بہبود ہے، سب کا خداوندوں کے ہاتھ
ہر اڑی میں دیتے ہیں آخر وہی بندوں کا ساتھ
دھریئے صحنک ارض کی، دیجے نیاز ارواح کی
اور خلوصِ دل سے عجلت کیجیے الحاح کی
حضرت دارا کی، شب جو خواب میں تھے جلوہ گر
صدقِ دل سے کیجیے منت، کہ ان پر ہو اثر
مانگیے ان سے دُعا، وہ برکتیں نازل کریں
آپ کو اور شہ کو اطمینان و راحت بخش دیں
اور عدم کی بے بصر ظلمت میں پوشیدہ رکھیں
عالمِ آلام کی کل آفتیں اور کلفتیں
خیراندیشانہ جو آیا سمجھ میں عرض ہے
دل گواہی دیتا ہے، نذر و نیاز اب فرض ہے
صدق دل سے یہ تمنّا ہے کہ ہو نیل مرام
اور بر آئیں مرادیں آپ کے دل کی تمام

آتسہ : راست ہے تعبیر اور تدبیر جو تم سے سُنی
ہاں! نیاز و نذر سے ہوگی تلافی خواب کی
میں محل میں جا کے کرتی ہوں یہ سارا اہتمام
عالمِ ارواح کے احکام ہیں یہ لا کلام

آپ نے جو کچھ کہا وہ باعثِ تسکیں ہوا
لفظ جو نکلے زباں سے ان میں تھی بوئے وفا
موجبِ اطمینان کا ہے یہ رفیقوں کا کہا
مجھ سے جو پوچھو تو میرا بھی یہی تھا مدعا
اب ذرا اتنا تو بتلاؤ اثینیہ ہے کہاں
ہے کہاں روئے زمیں پر خالِ یوناں کا نشاں

پیش خوانان : دور ہے اقصائے مغرب میں۔ جہاں پر آفتاب
آشیاں میں اپنے جا سوتا ہے مانندِ عقاب
خسروِ انوار یعنی حناورِ مشرق۔ جہاں
جا کے چھپ جاتا ہے۔ بس کہیے اثینیہ ہی وہاں

آتسا : ہاں! تمنا تھی مرے فرزند کی یہ دل نشیں
ایک دن اس ہی اثینیہ کو کرے زیرِ نگیں

پیش خوانان : تھا تقاضا دور اندیشی کا اس تجویز میں
ہو اثینیہ زیر تو یونانیوں کے سر جھکیں

آتسا : ان کی کیا تعداد ہو گی؟ کس قدر ہو گی سپاہ؟
کیا وہ اتنے ہیں مقابل ہو کے آئیں پیشِ شاہ؟

پیش خوانان : اس قدر ہیں مادیوں کو دی تھی زک اک مرتبہ!

آتسا : دولتِ وافر بھی رکھتے ہیں جماعت کے سوا؟

پیش خوانان : زعم ہے ان کو معادن پر جو ہیں زیرِ زمیں
وہ زمیں چاندی اگلتی ہے، کچھ اس میں شک نہیں

آتسر : کیسی ہے پرواز تیروں کی، نشانہ کیسا ہے؟
کیسے تیر انداز ہیں ؟ حربی خزانہ کیسا ہے؟

پیش خوانان : تیر اندازی تو کچھ ایسی نہیں ۔ لیکن سناں
تیز اور مضبوط ہے۔ مثلِ سپر ہیں چھاتیاں

آتسر : کون ہے فرماں روا، ہے کون ان کا گلہ بان ؟

پیش خوانان : سر جھکانا عار ہے ۔ ان کی عجب ہے آن بان
نام کس کا عرض ہو، ہے عار ان کو بندگی
انھوں نے مانی نہیں اب تک کسی کی سروری

آتسر : خود سروں کا غول کیا لائے گا تاب اک فوج کی
کیا لڑائی منتشر قطروں کی اور اک موج کی

پیش خوانان : کیا کہوں ! جس دن مہم در پیش تھی ہیلاس کی
حضرتِ دارا کو پیش آئی تھی صورت یاس کی
ان ہی غولوں نے اُلٹ دی تھیں صفیں ایران کی
آبرو رکھ لی تھی ان جانبازوں نے یونان کی

آتسر : یہ تو تم نے وہ کہا جو ہر جگر پر نقش ہے
یہ فسانہ سوس کے دیوار و در پر نقش ہے

پیش خوانان : لیجیے ! اب حال باقی بھی عیاں ہو جائے گا
سامنے سے آ رہا ہے ایک قاصد دوڑتا
دیکھنے میں تو نظر آتا ہے ایرانی کوئی
نیک ہو یا بد، اہم ہے یہ خبر یونان کی

پیامبر داخل ہوتا ہے۔

پیامبر: وائے بر ایران وامصارِ سوادِ ایشیا !
وائے بر ایں بندرِ خیر البلادِ ایشیا !
ایک ہی یورش میں سب فوجیں بکھر کر رہ گئیں
ایک ہی پالے میں سب کلیاں ٹھٹر کر رہ گئیں
وار ایک ایسا ہوا سب شان و شوکت لٹ گئی
وائے اے ایران تیری کشتِ قسمت لُٹ گئی
حیف! کیوں پیدا ہوا پیغام پہنچانے کو میں
حیف! کیوں زندہ رہا ایسی خبر لانے کو میں
کیا کروں، مجبور ہوں، کرتا ہوں حالت آشکار
وائے اُترے سب اجل کے گھاٹ پیادے اور سوار
وہ عجم کا عسکرِ جرّار و سربازانِ شاہ
ہوگیا ایرانیو! لشکر کا لشکر ہی تباہ

مقابل: بد نصیبی، شوم بختی، حیف ہے، صد حیف ہے!
اُف تباہی۔ وائے سختی، حیف ہے، صد حیف ہے!
وائے اے ایرانیو! اُٹھو صفِ ماتم بچھاؤ
ہائے اب ان تازہ زخموں پر ذرا آنسو بہاؤ
مجلسِ ماتم کرو برپا، کرو آہ و بکا
نوحہ و ماتم کرو، قسمت کا لکھا ہو چکا
خاک میں سب مل گئیں اُمیدیں مثلِ ریگِ راہ
رہ گئی لے دے کے خاکستر سو وہ بھی روسیاہ

ہے مگر آنکھوں کے آگے آفتاب ایران کا
مہرِ عالمتاب اپنے سوسہ و ہمدان کا

مدمقابل : کیا گھٹتی تھی مری پیری اسی دن کے لیے!
میری آنکھوں نے بھی بدلے مجھ سے گن گن کے لیے!
دیکھنی باقی تھیں کیا امیدیں ملتی خاک میں!
موت چُپ بیٹھی ہوئی تھی آج ہی کی تاک میں!
کیا رہیں اب تک کھلی آنکھیں کہ میں رویا کروں!
زخمِ دل کو آنسوؤں سے رات دن دھویا کروں!

پیامبر: اہلِ ایراں اس کو مت سمجھو شنیدہ داستاں
چشم دیدہ ہیں سیہ منظر، کیے ہیں جو بیاں

مقابل : وائے بدبختی کہ زہ ہو کر کمانِ تند و تیز
ہیچ ہو کر رہ گئی، افسوس، ہنگامِ ستیز
سَن سے اُڑتے تھے جو ناوک سب کماں میں رہ گئے
وہ طیورِ خفتہ گویا آشیاں میں رہ گئے
پیشِ ہیلاس مقدس، لشکرِ جرار ماد
ہیچ ہو کر رہ گیا، افسوس، مثلِ موجِ باد

پیامبر: پٹ گیا ساحل سلامس کا وہ لاشوں سے تمام
سو گئے جا کر دیارِ غیر میں سب خاص و عام

مدمقابل : وائے قسمت! پارہ پارہ ہو گئے اپنے جہاز
پُرزے پُرزے ہو گیا بیڑے کا سب سامان و ساز

مدّ و جزرِ بحر دیتا ہے بھلا کس کو اماں
تیرتی ہوں گی وہ لاشیں اور شکستہ کشتیاں
بے کفن ہوں گے جھکولوں میں خدا جانے کہاں
کب سکوں دے گا انھیں، خانہ بدوشِ آبِ رواں

پیامبر: اپنے تیروں کے مقابل تھیں عدو کی برچھیاں
کھا گئیں تیر افگنوں کو وہ برنجی برچھیاں

مقابل: وائے اے ایرانیو! ماتم کرو، نوحہ کرو
سینہ شق ہو جائے جس سے ایسا تم نالہ کرو
سُننے والوں کا بھر آئے دل، کرو ایسی بُکا
مٹ گیا ایران کا لشکر، کرو ماتم بپا
ہو گئے ایک ایک کر کے ختم، پیادے اور سوار
اب نہ وہ جانباز باقی اور نہ اُن کے راہوار

پیامبر: تجھ پہ لعنت ہو سلامس! نحس ہے تو لا کلام
آہ بن کر آئے گا دل میں اثینہ تیرا نام

مقابل: ق اے اثینہ تو نے چھوڑا بس یہی ایراں کے پاس
سونی سیجیں، خالی گودیں، نالہ و حرمان و یاس
لال جن کے خاک میں سوئے، وہ مائیں بے قرار
بیویاں جن کا سُہاگ اُجڑا وہ نالاں زار زار

آتسہ: صاحبو! تم دیکھتے ہو دم بخود سکتے میں ہوں
صدمہ وہ جانکاہ ہے، یارا نہیں نالہ کروں

رنج کے اظہار کی بھی مجھ میں اب قدرت نہیں
اور کی بپتا سُنوں کیا! سُننے کی طاقت نہیں
جب خداوندانِ عالم بھیجتے ہیں رنج و یاس
جُز تحمّل اور کیا رہ جاتا ہے بندے کے پاس
ہر مصیبت میں ہمیں ہمّت سے رہنا چاہیے
صبر و استقلال سے ہر رنج سہنا چاہیے
قاصدا! ضبط و تحمّل سے سُنا کُل داستاں
دل پہ جو بھی گزرے، تو ساری مُصیبت کر بیاں
ہم کو بھی لازم ہے سُن لیں صبر سے آخر تلک
گرچہ ہر اک لفظ نوکِ تیر ہے بے ریب و شک
ہاں! سُنا قاصد، لگے ہیں زخم کاری کس قدر
کام آئے کتنے سردارانِ فوجِ بحر و بَر؟
اپنے سرداروں کو کھو کر کتنے لشکر آئیں گے
کس قدر سر خیل واپس آ کے منہ دکھلائیں گے؟
صاف کہہ، ماتم کریں کس کس کا، ہم کس کس کو روئیں
نام پر کس کس کے دل کے خون میں آنکھیں ڈبوئیں

پیامبر: شکرِ یزداں ہے، سلامت ہیں شہِ عالی تبار
چشمِ بینا میں ہے اب تک ان کا روئے نور بار

آتسہ: نور سے معمور ہے تیری خبر میرے لیے
روزِ روشن بس یہی نکلا شبِ تاریک سے

پیامبر: اروعنبر وہ ہزاری شہ سواروں کا امیر
تھے کبھی زیرِ کماں جس کے ہنرمندانِ تیر
ساحلِ سلیمس کی سنگیں چٹانوں پر دراز
قالبِ بے جان ہے گور و کفن سے بے نیاز
دیدتیس یک ہزاری جو امیرِ بحر تھا
برچھی کھا کر بحر کا آساں نوالہ ہو گیا
باختر زادے شریف النفس طیناغوں کی لاش
کرتی ہیں موجیں ایاقس کے تھپیڑوں میں تلاش
لیلائیس، ارسامی، ارگس یشتی کے لاشے تمام
کھاتے ہیں امواج و ساحل کے تھپیڑے صبح و شام
رہنے والے نیل کی وادی کے یعنی قرنی کُس
آدی کُس، فارس کُس اور وہ بہادر ار کی کُس
کھا قلا بازی جہازوں سے گرے وہ بحر میں
چاروں کے چاروں ہوئے مدفون بحری قبر میں
نامور سرخیل فرسیس، مرطاس تھا جس کا نام
تین حملے جس نے یوناں پر کیے با اہتمام
جنگ آور ساتھ تھے جس کے جلو میں دس ہزار
فوج تھی جس کے سیہ پوشوں کی سب گھوڑے سوار
ارغواں ہے خون سے آج اس کی وہ ریش سیاہ
جس پر اس کو ناز تھا دارِ فنا میں، آہ آہ

وہ مجوسی آرتائیس اور باختر کا آرتام
سوتے ہیں ساحل پہ بے بالیں وہ دونوں نیکنام
امستر، امفیسترِ دونوں وہیں پر سو گئے
اہلِ سردِس ہیں بجا قسمت کو اپنی رو رہے
نیز وہ سرِسام مائیشہ جو ان کے ساتھ تھا
جاں بحق ہو کر انھیں کے پاس وہ بھی سو گیا
ق۔ سارِبس نامی رئیس اور ساکن لِرنیہ کہ تھا
ڈھائی سو جنگی جہازوں کا امیر اور ناخدا
سنگدل ساحل کے پہلو میں وہ سویا بے خبر
ناخدا پہنچا خدا کے پاس کشتی چھوڑ کر
سائی نیسِس صقلیہ کا جو جری سردار تھا
وہ تنِ تنہا ہزاروں کے مقابل تُل گیا
موت پائی اک یِلِ جانباز کی اس نیک نے
صف پہ صف رکھدی ہزاروں کی اُلٹ کر ایک نے
یہ سُنائے نام میں نے ان کے جو تھے نامور
جنگ کے میداں سے یوں تو کر گئے لاکھوں سفر
آتسہ: حیف ہے، صد حیف! کافی سے زیادہ سُن لیا
تھی مقدر میں ندامت اور یہ آہ و بکا
حال باقی رہ گیا جو کچھ ذرا دوہرا اسے
ایسے کتنے تھے سفینے جنگ میں ہیلاس کے؟

وہ ہماری بحری طاقت کے مقابل کیسے آئے؟
حوصلہ کیوں کر ہوا کیسے ہماری تاب لائے؟
سینہ بر سینہ ہمارے بیڑے سے ٹکر جو لی
ان میں یہ جرأت بھلا آخر کہاں سے آگئی؟

پیامبر: محترم بانو! اگر تعداد پہ ہوتا مدار
یہ حقیقت ہے کہ ہم تو ہو چکے تھے کامگار
اک ہزار اپنے تھے اور کُل تین سو اُن کے جہاز
ان کے گنیے اور دس جن کا نیا تھا بحری ساز
سات اور دو سو ہمارے اور بھی تیار تھے
یہ تھے سارے بادبانی، وہ صبا رفتار تھے
طاقت اور تدبیر جو کر سکتی تھی سب کچھ ہُوا
اور حفاظت کے لیے، جو کچھ نہ کرنا تھا کیا
جو ہوا، انصاف کی رو سے سراسر ظلم تھا
تھا تباہی کا سبب پردے میں کوئی دیوتا
کہنا پڑتا ہے! یہ کارستانی تھی پالاس کی
کی حفاظت اُس نے اپنے شہر اور ہیلاس کی

آتسہ: کیا اثینہ رہ گیا محفوظ پھر بھی جوں کا توں؟

پیامبر: بے فصیل اور بے پنہ ابتک ہے یوں ہی جوں کا توں!

آتسہ: پھر! کیا آغاز کس نے معرکہ انجام کار؟
یوں تو اپنی فوج پر نازاں تھا میرا شہریار

پہل کی یونان نے یا لشکرِ ایران نے
رزم کا نقشہ جمایا کس کے اطمینان نے

پیامبر: کیا کہوں میں کون پہلے معرکہ آرا ہوا
یا وہ کوئی دیوتا یا منتقم عفریت تھا
آیا اک یونان کے لشکر سے کوئی اجنبی
اور شہ ایران کی خدمت میں اس نے عرض کی
"ہوتے ہی تاریکیٔ شب یاں نہ ٹھیرے گا کوئی
سر چھپا کے بھاگنے کو ہیں ہمارے آدمی
اپنے اپنے چپو لے کر کر رہے ہیں انتظار
سب ہوا ہو جائیں گے وہ پاتے ہی راہِ فرار"
شاہ نے یہ سنتے ہی فرمان جاری کر دیا
کر رہے تھے دام اُدھر تیار حاسد دیوتا
شاہِ ایراں بے خبر ان کے فریبوں سے رہے
دیوتا لیتے ہیں بدلے کس طرح انسان سے
ہر امیر البحر کو فرمان یہ جاری ہوا
تین حصّے کر کے بھیجو بیڑے کو بہرِ وغا
مہر عالمتاب جب واپس بلائے روشنی
معبدِ افلاک پر چھا جائے جس دم تیرگی
عسکری اور ناخدا تیار ہو کر سر بکف
لے کے بیڑہ گھیر لیں بحرِ ایاقس صف بہ صف

گھیر لیں سب فوج شوئیدہ ایاقس کے درے
اور ایک یونان کی کشتی کوئی جانے نہ دے
اور اگر یونانیوں کا کوئی دھوکہ کھا گیا
یعنی سہواً بھی انھیں بچ کر نکل جانے دیا
دستۂ بحری کے سرداروں کے ہوں گے سر قلم
اس قراول کے خطاکاروں کے ہوں گے سر قلم
آپ کے دلبند نے احکام جب صادر کیے
سطوتِ شاہانہ سے محکوم سب تھرّا گئے
بھول کر بھی شاہ کو آنے نہ پایا یہ خیال
پورتے ہیں دیوتا کن کن مصائب کے یہ جال
کی ہر اک سردار نے تعمیل اس فرمان کی
فکر کی توشہ کی اور ہر قسم کے سامان کی
سارے ملّاحوں نے اپنی کشتیاں تیار کیں
پہلے ہی سے کھونٹوں میں سب اپنی ڈانڈیں باندھ دیں
جب ذرا خورشید کا دھیما ہوا نوری جلال
اور جھپٹ کر آیا شاہیں کی طرح شب کا ظلال
کشتی راں چپو پہ بیٹھے اور لنگر اُٹھ گئے
مثلِ گیسو بادباں کھولے جہاز آگے بڑھے
اسلحہ کے مہتمم تھے ساتھ امیر البحر کے
ان کے مرزابوں کے لنگر سب سے پہلے اُٹھ گئے

ایک صف کہنے لگی یہ دوسری سے چیخ کے
"چاہیے ہر ایک کو تیار صف آرا رہے"
رات بھر ملّاح اپنی کشتیاں کھیتے رہے
صبح ہوتے آبنائے کے سرے پر آ گئے
پو پھٹے یونان کے بیڑے نے جب دیکھا اُدھر
ہر طرف اُس کو فصیل اک تیرتی آئی نظر
اس طرف موجود تھے یونان کے سارے جہاز
جو خبر شہ کو ملی وہ تھا فریبِ خانہ ساز
آخرش جب روزِ روشن رخشِ ابیض پر سوار
ٹوٹ کر آیا محیطِ بیکراں پر بے قرار
اک غنائی بانگ آئی لشکرِ یونان سے
ان کا مقصد تھا شگونِ نیک اس اعلان سے
کوہِ ساحل کا جواب آیا بلند آہنگ سے
تارِ بربط گونج اُٹھے گویا صدائے چنگ سے
فوج ایرانی پر اس سے خوف طاری ہو گیا
نعرۂ ہیلاس وجہِ بے قراری ہو گیا
سب قیاسوں کی فریب آرائیاں بے سود تھیں
کشتیاں یونان کی سلمس میں سب موجود تھیں
یوں فضا میں پرچمِ ہیلاس تھا لہرا رہا
نعرۂ بشاش جیسے جنگ جو افواج کا

وہ خروشش انگیز نعرہ جو رجز آمیز ہو
تیر جس سے آتشِ میدان رستاخیز ہو
تھا نہ اس پرچم کا لہرانا تذبذب موج کا
مثلِ نعرے کے بڑھاتا تھا دل اپنی فوج کا
پھر صدائے بوق و قرنا پھیلی موجِ بحر پر
اور یکایک پڑ گئے چپو سمندر میں اُدھر
تال سُر سے پھر شپاشپ کی صدا آنے لگی
موج پر آواز اس نغمے کی منڈلانے لگی
ہو کے سب آراستہ پھرتی سے دشمن کی صفیں
معرکہ آرا ہوئیں یوں عرصۂ پیکار میں
پہلا حملہ ان کے دستِ راست نے ہم پر کیا
دیکھتے ہی دیکھتے پھر سارا بیڑہ آ بڑھا
ایسا اک نعرہ لگایا جیسے جو آسماں
چرخ بھی تھرا گیا مثلِ درفش کاویاں
دی صدا "یونان کے فرزند! ہاں آگے بڑھو
آج موقع ہے، بچا لو دین کو، یونان کو
ہاں! فدا ہو جاؤ تم گھر بار پر، یونان پر
ہر زیارت گاہ پر، درگاہ پر، ایمان پر
سر لگا دو آج تم آزادیِ یونان پر
بیوی بچوں کے لیے تم کھیل جاؤ جان پر

کہہ رہے ہیں آج یہ تم سے بزرگوں کے مزار
شمعِ آزادی کے پروانو! کرو جاں تک نثار
کہہ رہے ہیں ہر زن و فرزند، جو آزاد ہیں
کچھ تمھیں پیمان آزادی کے اپنے یاد ہیں؟
لگ چکا ہے داؤں پر گھر بار سارا دیکھنا
جیت ہی کر آؤ تو تم منہ ہمارا دیکھنا
عسکرِ ایراں کا بھی ایسا ہی اک نعرہ لگا
پھر تو گیا ہی پوچھنا تھا، ہو گیا محشر بپا
کشتیوں پر کشتیاں یک لخت ہم پر آ پڑیں
جوڑ کر اپنے برنجی ناکے جنگ آور ہوئیں
ٹکّریں لینے لگیں، کرنے لگیں بڑھ بڑھ کے وار
اور جہازوں کو ادھر دیتی نہ تھیں پل بھر کو بار
دار پہلا کشتیٔ فینیق پر آ کر کیا
توڑ پھینکا اس کے ماتھے پر سے بت ناہید کا
بھڑ گئے اور گتھ گئے اک دوسرے سے کل جہاز
دوست اور دشمن کا مشکل ہو گیا واں امتیاز
قلب بیڑہ کا ہمارے پہلا دھچکہ سہہ گیا
پھر تو بیڑہ ایک وبالِ جان ہو کر رہ گیا
کثرتِ تعداد ہی خود ایک آفت ہو گئی
اس طرح سے پھنس گئے بیکار طاقت ہو گئی

ان جہازوں کا بڑا ہونا مصیبت ہو گئی
آبنائے تنگ تھی، گھسنے کی دقّت ہو گئی
پھنس گئے ایسے، جہاز اک دوسرے سے اڑ گیا
اپنا بیڑہ یوں کہو آپس میں گویا لڑ گیا
ہو گئیں آپس میں گتھم گتھا کشتیوں کی بلّیاں
توڑ پھوڑ ایسی ہوئی اُلٹیں ہماری کشتیاں
وار چالاکی سے ہر جانب سے وہ ہم پر ہوئے
کشتیوں کے ڈھیر اور کشتوں کے پشتے لگ گئے
بیندے اوندھے کچھ جہازوں کے نظر آنے لگے
خود ہماری کشتیوں ہی کے تھے یہ اُلٹے تلے
کشتوں کے انبار سے نیلا سمندر پٹ گیا
لاشوں سے پتھریلا ساحل اور بندر پٹ گیا
بیڑہ تتر بتر ہو کے رہ گیا ایران کا
پڑ گیا ہر ایک کو فکر اپنی اپنی جان کا
پیچو جس کے پاس تھا وہ کشتی راں اور ناخدا
جس طرف مُنھ اُٹھ گیا لے اپنی کشتی چل دیا
وہ تو بچ نکلے کہ جن کو مل گئی راہِ فرار
باقیوں کا اس طرح یونانی کرتے تھے شکار
ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کے ٹکڑوں اور مستول سے
مچھلیوں کی طرح ہم کو مارتے تھے ہُول سے

آہ و زاری کا سمندر پر وہ چھایا شور و غل
ہو گیا آخر چراغ روز ہنگامہ میں گل
سر کیا اک تیر چشم تیرہ نے پھر رات کی
منظر خونی کی جس میں خونفشانی ڈھک گئی
آفتوں کے قصّے جتنے ہو سکے وہ کہہ دیئے
ورنہ اک عشرہ بھی کم ہے داستاں کے واسطے
ق　یہ یقیں کر لیجیے اے مہرباں بانو مگر
آج تک نیّر نہیں چمکا وہ روئے ارض پر
چشم نے دیکھا ہو جس کی موت کا ایسا سماں
گوش نے جس کی سُنی ہو یہ اجل کی داستاں

آتسہ : شہرۂ آفاق ایراں کس بلا میں گھر گیا!
آفتوں کا کیسا یہ ہم پر سمندر پھر گیا!

پیامبر: ماجرائے غم سُنا جو آپ نے آدھا نہ تھا
اس سے دوگنا اور باقی ہے، اور اس سے بھی سوا

آتسہ : ہو چکے برباد، جو آنی تھی آفت، آ چکی
اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی جو بیتا رہ گئی

پیامبر: نونہالانِ وطن، ایراں کے گلہائے شباب
نوجوانانِ جری، ریعانِ چشمِ انتخاب
جو شجاعت اور نجابت میں تھے خود اپنی مثال
با رسوخ اور معتمد شہ کے تھے جو فرخندہ فال

پارسی وہ شاہزادے ہو گئے ایک ایک فنا
نام پر افسوس رُسوائی کا دھبّا رہ گیا

آتسہ: ہائے! میں بدبخت کیوں زندہ ہوں سُننے کے لیے
رہ گئے رونے کو ہم اور وہ عدم کو چل بسے
گذری کیا شہزادگانِ سوس پر روزِ وغا
وہ ہوئے کس طور سے راہی سوئے مُلکِ بقا؟

پیامبر: سالمس کے سامنے اور آطقہ سے کچھ جریب
ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا کنارے کے قریب
یہ خدائے رقص یعنی پاآن کا فردوس ہے
ناخدا اور کشتیوں کے واسطے منحوس ہے
یہ جزیرہ ساحلِ ہیلاآس کے نزدیک تھا
شاہ نے اس پر تقرّر شاہزادوں کا کیا
سامنے ہی لڑ رہے تھے سرفروشوں کے پرے
وہ وہاں ان کی کمک کے واسطے موجود تھے
حکم تھا ان کو "کرو ہر ایک دشمن کو دونیم"
منتشر ہو جب ہزیمت کھا کے یونانی غنیم
یہ جزیرہ پایا تھا سرداروں کا جائے قرار
تاکہ کر پائیں ہزیمت خوردہ دشمن کا شکار
حیف! کیا منحوس پھر ثابت ہوا یہ انتظام!
یعنی خود تلوار ہی کو کھا گیا اُس کا نیام!

پیش یہ آیا کہ یونانی رہے فیروز مند
دیوتاؤں کی عنایت سے رہے وہ سربلند
اس جزیرے پر وہ لپکے کشتیوں سے کود کر
کرلیا محصور اسے، چھوڑی نہ ایک راہِ مفر
زرہ میں ملبوس تھے یونان کے سب عسکری
گھیر کے ہر سمت سے کرنے لگے غارت گری
پھر تو اس میدان میں کشتوں کے پشتے لگ گئے
ہر طرف سے ٹوٹ کے یونانی ان پر آپڑے
بھنبھناتی تھیں کمانیں، سَن سے اُڑتے تیر سار
کچھ ہوئے تیر و سناں کچھ سنگساری کے شکار
ق۔ گھِر کے بے بس شاہزادے ہوگئے سب نذرِ تیغ
اس طرح سے ظالموں نے چھانٹ ڈالا بے دریغ
کان تک آنے نہ پائی آہ کرنے کی صدا
ہاں مگر خود شہریارِ سوس نے نالہ کیا
سامنے ہی وہ سریر آرا تھے ایک اونچان پر
اور مصاف چونکہ کاں تھا سب کا سب پیشِ نظر
دیکھتے تھے شاہ خود سب واقعاتِ کارزار
جو مصیبت پیش آئی اس پہ روئے زار زار
چاک کر ڈالا گریباں، نوحہ و ماتم کیا
باقی ماندہ فوج کو فرمانِ پسپائی دیا

عرصۂ پیکار سے بچ کر روانہ ہو گئے
پیچھے رہنے والے دشمن کا نشانہ ہو گئے
چن دیا صدمے نے یہ پربت پہ پربت رنج کا
ہے جہاں ماتم کدہ تقدیر کے نیرنج کا
اے رفیقو! آؤ، اب سب مل کے ہم ماتم کریں
اشکباری، سینہ کوبی، نوحۂ پیہم کریں

آتسر: ایزدِ قہار! پھانسا کس شکنجے میں ہمیں!
ہو غضب تیرا تو پھر فریاد بھی کس سے کریں
شہرۂ آفاق ایتھنہ نے لیا سخت انتقام
کر دیا ایران کی تقدیر کو آتش بجام
کم نہ تھے پہلے ہی مقتولین ماراتون کے
تازہ خونریزی نے جس میں یہ اضافے کر دیے
حیف، تھی پیشِ نظر جو سرزنش ایران کی
اے مرے لختِ جگر، وہ خود تجھے پیش آ گئی
قاصدا! وہ بھی سُنا باقی رہی جو داستاں
تو نے چھوڑیں کس جگہ پر باقی ماندہ کشتیاں

پیامبر: مابقی افراد کی بھر مٹھی سی اک قطار
سب نحیف و زار، اس پر تشنگی سے بیقرار
گزری جب اُفتاں و خیزاں پیوشیہ کی ارض سے
بعض پیاسے مر گئے، گو تھا سمندر سامنے!

جو بچے فاقہ زدہ ہارے تھکے، آگے بڑھے
گرتے پڑتے، ہانپتے، فوقیہ تک وہ آگئے
دوریہ سے آگے چل کر تھی خلیجِ میلیہ
میلیہ سے آگے بڑھ کر تھی زمینِ آکیہ
بیچ میں بہتا ہے دریاے سفرخس ہے رواں
کرتا ہے سیراب جو اس سرزمیں کی کھیتیاں
ان علاقوں سے گزر کر بھوکے پیاسے عسکری
پہنچے تھسلی میں جہاں اکثر نے آخر جان دی
سرد موسم سے اماں تھی، اور نہ فاقوں سے اماں
ان علاقوں میں تھے دشمن خود زمین و آسماں
تشنگی اور فاقے نے چھوڑا نہ دامانِ حیات
راستے بھر ان وباؤں سے ملی مرکر نجات
آگے بڑھ کر آئے مغنیشیہ اور مقدونیہ
پھر جو سے اقیس بلبی جھیل اور ایدونیہ
آبِ بلبی کے کنارے تھا گھنا ایک نیستاں
بڑھ کے ایدونیہ سے تھا پنجیانی کہستاں
بس یہاں پہنچے تھے کہ سردی کا موسم آگیا
ناگہاں، بے وقت، گویا یہ پیامِ موت تھا
اس بلا کا بھیجنے والا تھا کوئی دیوتا
پاک دریا اسطریمن رات بھر میں جم گیا!

منکروں کو بھی یہاں آکر خدا یاد آگیا
ملحدوں نے بھی اجل کے خوف سے سجدہ کیا
آج حفظِ جاں کی تھیں یہ سب دعائیں بے اثر
بن گیا یخ بستہ دریا برفنا کی کا سقر
بچ گئے وہ جو شبا شب کر گئے دریا عبور
نیّرِ قادر کا جمکا صبحدم ہر سمت نور
جب چلک کر دھوپ نکلی قرصِ عالمتاب سے
برف پگھلی، یعنی بندھن ٹوٹے جوئے آب کے
ابھریں لہریں شوم بختی کی، وہ تہ سے خوفناک
رہ گئیں امیدیں جی بچنے کی ساری ہو کے خاک
پار جانے کے لیے دریا میں کودے عسکری
گر رہے تھے جیسے ریوڑ، آدمی پر آدمی
کشمکش اور نفسی نفسی کا تھا منظر وہ مہیب
ہو گیا بو جاں بحق پہلے، رہا وہ خوش نصیب
یا خدا، یا دل ہمارا جانتا ہے وہ ستم
مرز و بوم غیر میں سر سہ کے جو آئے ہیں ہم
چند ہم آفت رسیدہ جھیل کر رنج و محن
ترا قیہ کی راہ سے مشکل سے پہنچے ہیں وطن
خیر سے گھر بار دیکھا، خیر سے دیکھا وطن
یہ عنایت ہے خدا کی، شکرِ ربِّ ذوالمنن

گو بہت کچھ چھوڑ کر یہ عرض کی ہے داستاں
قصّۂ آفات سچ ہے جو کیا میں نے بیاں

پیش خوانان : داورِ قہار! کس آفت کا ساماں ہوگیا
ایک ٹھوکر میں تری پامال ایراں ہوگیا

آتسر : کیا سیہ بختی ہے، غارت ہوگیا عسکر تمام
پیش گوئی تم بزرگوں کی بھی کچھ آئی نہ کام
ہاں! مگر یہ صاف ہے تعبیر میرے خواب کی
پیش گوئی ٹھیک نکلی دل کے پیچ و تاب کی
کہہ گئی تھیں جو شبِ تیرہ میں روحیں ٹھیک تھا
خواب کے پردے میں جو دیکھا تھا آگے آگیا
خیر پھر بھی ہے صلاح نیک پر لازم عمل
نذر اور صدقے سے کہتے ہیں بَلا جاتی ہے ٹل
آستانے پر خداوندوں کے اب جاتی ہوں میں
بارگاہِ قدس میں سجدہ بجا لاتی ہوں میں
ارض کی دیبی کی صحنک جا کے میں دھرواؤنگی
اور تبارک کی نیاز ارواح کی دلواؤنگی
لے کے کاکِ پاک جاتی ہوں درِ معبود پر
بس رضا جوئی خداوندوں کی ہے پیشِ نظر
ہوتی ہوں رخصت بس اتنا اور کہہ کے آپ سے
کام جو آئے مصیبت میں وہ سچا دوست ہے

جو بُرے وقتوں میں کام آئے، بڑی نعمت ہے وہ
جو اڑی میں ساتھ دے جائے، بڑی دولت ہے وہ
امتحاں ہوتا ہے نازک وقت میں انسان کا
وقت ہوتا ہے وہی ہمدرد کی پہچان کا
کوئی دم میں آنے والے ہیں شہِ ایراں یہاں
میرے پیچھے وہ اگر تشریف لائیں ناگہاں
لیجیے گا دردمندی اور دل جوئی سے کام
کیجیے گا چارہ سازی اور رفاقت سے کلام
وقت ہوتا ہے بڑا نازک ہجومِ یاس کا
دل میں ہوتا ہے عجب عالم بُرے وسواس کا
لینے کے دینے نہ پڑ جائیں خدا ناخواستہ
اور ہی خطرے سے پڑ جائے نہ ہم کو واسطہ
(رخصت ہوتی ہے)

پیش خوانوں کا نوحہ

اے شہِ افلاک! اے برجیس تو نے کیا کیا
یا الہ العالمیں! یہ کیا غضب نازل ہوا
ق۔ بے شمار اور لاف زن وہ چیدہ چیدہ عسکری
اپنی قوت پر جو نازاں تھی کبھی فوجِ جری
وا دریغا! ہو گئے جانباز وہ سارے فنا!
ہو گیا لشکر کا لشکر راہیِ مُلکِ بقا!

اک نقابِ ماتمی میں چھپ گئی سوسہ کی شان
پردۂ غم میں ہوا روپوشس زعمِ اکبتان
نازنیں بھرپور تھی جن کی جوانی کی بہار
چاک کرتی ہیں گریباں روتی ہیں زار و قطار
دستِ نازک سے خود اپنے چاک کرتی ہیں نقاب
بن گئی ایک چشمۂ آلام ہر چشمِ پُر آب
برف گوں سینوں پہ بارش ہو رہی ہے اشک کی
لگ گئی ہر آسمانِ چشمِ شہلا سے جھڑی
کیا ہوئے وہ ان کے شوہر اُجڑا کیوں اُن کا سہاگ
سیجیں سونی رہ گئیں، پھوٹے سیہ بختوں کے بھاگ
کیا پھٹا پڑتا تھا اُن کڑیل جوانوں کا شباب
غنچگی کی تازگی پر تھی نہ کیا کچھ آب و تاب!
وہ عروسی ارغواں سیجیں کہاں باقی رہیں
دلہنوں کی رنگ رلیاں خاک میں سب مل گئیں
اب نہیں تھمنے میں آتی ان کے اشکوں کی جھڑی
رنج ہو کر رہ گئی وہ راحتوں کی زندگی
مرثیے سے دیکھیے اب اُن کے نالے کا جواب
نالۂ دل ہی ہوا کرتا ہے نوحے کا جواب

طائفہ کا مرثیہ : ایشیا کے گوشے گوشے میں ہے اب آہ و بکا
گریہ وزاری ہے گھر گھر، سوسہ ہے ماتم سرا

ہائے سونی گود والی، وائے بیکس نوحہ گر
موت کے آغوش میں پہنچے ترے سختِ جگر
خانہ ویرانی کا باعث ہو گیا خود شہریار
اک چھلاوے کے تعاقب پر کیا سب کچھ نثار
خانماں برباد ہونے کے تھے منصوبے وہ خام
کشتیاں آراستہ کیں بادبانوں سے تمام
یہ نہ تھا ناوک فگن دارائے اعظم کا چلن
یوں شکستہ حال وہ آیا نہ یوناں سے وطن
اس خدنگ انداز دارا کا ہے دل میں احترام
وہ کبھی یوں لوٹ کر آیا نہ بے نیل و مرام

مدمقابل: ق۔ تو نے دیکھی تھیں سیہ رو کار والی کشتیاں؟
چھوڑتی تھیں پیک سی، جو کالی کالی کشتیاں؟
بحر کی شوریدہ سر موجیں جہاں تھیں بے قرار؟
کشتیاں پر تولے جس جا تیرتی تھیں۔ قاز وار؟
مارتی تھیں ٹھونگیں چونچوں سے جھپٹ کر کشتیاں
گرتی تھیں یونان کی ایرانیوں پر کشتیاں
غرقِ دریا ہو گیا بیڑہ بھرے لشکر سمیت
قبرِ آبِ شور میں سب سو گئے عسکر سمیت
گر رہے تھے ٹوٹ کر مستول واں ایران کے
ڈوبتے تھے عسکری اور کشتی راں ایران کے

ہو رہا تھا جب اجل کے تیر کا عسکر شکار
بچ کے نکلا سخت مشکل سے ہمارا شہریار
سرحدِ یوناں میں جھیلیں کیا سفر کی سختیاں
ژالہ باری اور زمستاں تھے سقر کی سختیاں

مقابل : جو ہوئے نذرِ اجل پہلے شہیدانِ وطن
برسرِ ساحل کہیں ہوں گے وہ بے گور و کفن
کیخرائی بحر کی وہ موجہائے تیز گام
ہوں گی ان کی بے کفن لاشوں پہ کیسی خوشخرام
نوک ہے اس نشترِ اندوہ کی وہ جانگزا
ہے رگِ جاں بلکہ مغزِ استخواں جس کی غذا
اس قلق کا بار سینے میں سما سکتا نہیں
ازدحامِ رنج کنجِ دل میں آ سکتا نہیں
چیر دے جو سقفِ گردوں، کیجیے ایسی فغاں
نالہ ایسا ہو کہ اُڑ جائیں فلک کی دھجیاں

مدمقابل : وائے میری بدنصیبی ! اے شہیدانِ وطن
ہو کہاں بپھری ہوئی موجوں میں تم اب غوطہ زن !
ہائے وہ دریائی گونگے، ہائے وہ بحری نہنگ
تکّا بوٹی کر رہے ہوں گے تمھاری بے درنگ
صاف اور ستھرے سمندر کی بھیانک مچھلیاں
کر کے نوش جان چھوڑیں گی نہ حلیے کا نشاں !

سونے ہو کر رہ گئے گھر جن کے وارث اُٹھ گئے
جن کی اولادیں گئیں گھر ان کے ہیں ماتم کدے
گریہ وزاری میں ہیں مصروف پیر و ناتواں
روتے ہیں اور رو کے سنتے ہیں بیانِ جانستاں

مقابل : ختم ہونے بھی نہ پایا تھا ابھی ماتم ادھر
ہو گئے باغی، حکومت سے کئی شوریدہ سر
بعض کا اپنی رعایا میں سے ہے یہ حال آج
کرتے ہیں انکار وہ آقا کو دینے سے خراج
یہ تو یہ، اب کورنش سے بھی تغافل ہے انھیں
سجدہ گہ پر بوسہ دینے میں تامّل ہے انھیں
اب نظر میں ان کی وہ ایران کی صولت نہیں
وہ پرانا دبدبہ وہ شان وہ شوکت نہیں
مدّتوں تک تازہ دم طاقت رہی ایران کی
ان کی نظروں میں کہاں اب وہ حکومت شان کی
اب فراست اور دانائی سے لے گا کون کام
سب زبانیں ہر کس و ناکس کی ہوں گی بے لگام
وہ بلند آہنگ ہو گی اب نکوہش کی زباں
چھوٹ نکلے گی شکایت بے دہانہ بے عناں
روک سکتا ہے بھلا مخلوق کی کوئی زباں
ہو چکیں ہوں ملک میں جب اس قدر بربادیاں

مقتلِ یوناں اگل دے گا کوئی اپنا شکار
جو بنا ہے خون سے ایرانیوں کے لالہ زار
اب بھلا کیا لوٹ کر آئیں گی ریحانِ وطن
بیٹھنے والے ہیں چُپ ہو کر یہ سُکّانِ وطن؟
دیکھا ان آنکھوں نے جو کچھ پھر نہ دیکھیں گی کبھی!
صورتیں جو چھُپ گئیں، کب دیکھنے میں آئیں گی!

آتسہ داخل ہوتی ہے۔

آتسہ: دوستانِ باصفا! واقف ہے جو اندوہ سے
جانتا ہے وہ دلِ اندوہگیں کے مرحلے
ساحلِ دل پر امنڈ کر آتی ہے جب موجِ یاس
دیکھتا ہے غمزدہ چاروں طرف بیم و ہراس
غور کرتے کرتے چہروں کو ہجومِ یاس کے
ڈوبی پاتا ہے ہر اک شے رنگ میں وسواس کے
بے غل و غش رودِ خوش بختی اگر بہتی رہے
دل قوی رہتا ہے، دن کٹتے ہیں اطمینان سے
بھول کر بھی یہ گماں دل میں کبھی آتا نہیں
ناگہاں خود آسماں بن جائے گی اک دن زمیں
وہ سمجھتا ہے ہمیشہ ربِ جنات النعیم
کشتِ راحت کے لیے بھیجے گا فردوسی نسیم
آج جو حالت ہے میری اس کو کر لیجے قیاس
دل میں کیا کچھ ہول ہے، کیا کیا نہیں خوف و ہراس

گوش میں آتی ہے ناقوسِ مقدر کی صدا
بج رہا ہے کان میں گھڑیال سا تقدیر کا!
کر رہا ہے فال بد کی پیش گوئی قلب میں
ہوش گم ہیں، وہم کی ہیں لاکھ دل میں صورتیں
تم نہیں پاتے مجھے شاہی ارابہ پر سوار
کرّ و فر کا آج کیوں محتاج ہو شاہی وقار
آج شانوں پر مرے وہ شالِ زردوزی نہیں
وہ لباسِ فاخرہ کی جلوہ افروزی نہیں
سادگی اور عاجزی میں ہے نیاز بے نیاز
سادی سے سادی ہے جو لائی ہوں نذرِ کارساز
یہ چڑھاوا روح کا اور نذر یہ دارا کی ہے
یہ نیاز اقلیمِ ظلمت کے سریر آرا کی ہے
یہ اچھوتی گائے کا لائی ہوں صحت بخش شیر
انگبین ناب ہے یہ، دیکھیے مثلِ عصیر
چوسنے والی نے پھولوں سے نکالا ہے اسے
قطرہ قطرہ کرکے امرت سا نتھارا ہے اسے
اور اچھوتے چشمۂ کوثر کا یہ نوشاب ہے
نیز خالص فرح بخش انگور کا دوشاب ہے
یہ شکم سے ایک خودرو تاک کے پیدا ہوا
تا کرِ ادِ قدرتی کی اس نے کھائی ہے ہوا

زردی مائل سبز پھل لائی ہوں یہ زیتون کا
اُس شجر کا دانہ جو سرسبز رہتا ہے سدا
ہار خوشبودار پھولوں کے یہ لے کر آئی ہوں
گوندھ کر طرّے گلوں کے ساتھ اپنے لائی ہوں
یہ زمیں کے لال ہیں، جو اُم لالہ زار ہے
جس کی پیداوار کل دنیا کا سبزہ زار ہے
اے رفیقو! اے عزیزو! میری اک درخواست ہے
اب یہاں ہر اک حضورِ قلب سے الحاح کرے
جب انڈیلوں ارض کے دامن میں مَیں اپنی نیاز
بارگاہِ حضرتِ دارا میں یہ پہنچی نیاز
حضرتِ دارا سے مل کر یہ کیجیے گا التجا
کیجیے گا بارگاہِ قدس میں مل کر دُعا

پیش خوانان: پارسی ملّت کی بانو! محترم ایران کی
پیش کیجے عالم ظلمات کو آپ التجی
ہم اِدھر سب مل کے کرتے ہیں مناجات و دعا
تاکہ سُن لیں عالمِ ارواح کے فرماں روا
"اے مقدّس طاقتو! اے غمگسارانِ عدم
کشورِ تاریک کے دیہیم دارانِ عدم!
اے شہ ہرمیز! اے ارواح کے فرمانروا
اے مقدس ارض! اے ایران کے حاجت روا

تاجدار عالمِ ظلمات اب یہ کیجے کرم
بھیج دیجے عالمِ روشن میں دارا کے قدم
خاورِ ارواح! سب پر تیر نے والے شہا!
کیجے ایجاب اپنے مستغیثوں کی دعا
جن مصائب کی گرانباری سے ہیں ہم پشت خم
ہو اگر ان سے سبکدوشی، بڑا ہو گا کرم
ان بلاؤں کا اگر درماں کوئی دنیا میں ہے
وہ بلاشک صرف دستِ حضرتِ دارا میں ہے"

مناجات طائفہ

سایۂ رحمت میں رہنے والے اے ایراں نواز
ایزدی تائید سے فرمایے اب سرفراز
التجا سُن لیجیے بندوں کی اے بندہ نواز
بہہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندّیاں بہرِ نیاز
شور اب وہ نالہ و شیون کا کرتا ہوں بپا
عالمِ اسفل میں پہنچے شاہِ ایراں تک صدا

مد مقابل: التجا ہے ارض سے اور عالمِ لاہوت سے
عالمِ تحت الثریٰ کے حکمراں ملکوت سے
ہیں دیارِ روح کے جو قصر و ایواں میں مکیں
کشورِ ظلمات کے آسودگاں زیرِ زمیں
کاخِ تاریکی سے بھیجیں خسروِ ایراں کی روح
تھا کبھی جو ایشیا و سوسہ و ہمداں کی روح

گل نہ پھولا آج تک کوئی گلِ ایران سے
ہوتی نسبت جس کو دارا کے شکوہ و شان سے

مقابل : پاسبانِ روضۂ اطہر! اجل کے بادشاہ
تربتِ دارا کے نگراں! داورِ ظلمت پناہ
خاک جس کی اس مزارِ پاک میں مستور ہے
دلبرِ ایراں وہ آنکھوں کا ہماری نور ہے
سُرمۂ چشمِ تصور ہے، اسی تربت کی خاک
اس زمیں کی خاک سے ہے دیدۂ دل تابناک
اے اجل کے رازداں! اے ایدنوسِ سخت گیر!
اے قضا کے حکمراں! ہو جائیے اب دست گیر
روحِ دارا کو حراست سے رہا کر دیجیے
عالمِ اجسام میں پھر رونما کر دیجیے
فرشِ اسفل سے وہ آئیں اُٹھ کے روے ارض پر
بام پر روضہ کے ہوں اک مرتبہ وہ جلوہ گر
عالمِ ناسوت میں آنے کی مہلت دیجیے
خیر سے دُنیا میں آجانے کی صورت کیجیے

مدمقابل : وہ شہِ ذی شان تھا اک رہنماے ایزدی
پند سے جس کی رہا ایران خطروں سے بَری
جنگ میں اس نے نہ کٹوائے ہزاروں آدمی
کب مرے یوں رزمِ رسوا کن میں اس کے عسکری

وہ خجستہ بخت، فرخ فال تھا وہ ارجمند
لشکرِ جرار جس کا تھا سدا فیروز مند

مقابل : اے جلیل القدر آقا، ہوجیے اب جلوہ گر
لایئے تشریف اپنے مقبرے کے بام پر
کلغی و سرپیچ کی دِکھلایئے رخشندگی
زعفرانی کفش کی آئے نظر تابندگی
گِھر کے آئی ہے گھٹا ہم پر شبِ ظلمات کی
چھا گئی بحرِ سطحیہ کی گھٹا آفات کی
جلوہ آرا ہوجیے ایک بار اے مشفق پدر
کیجیے ہم پر کرم اور مہربانی کی نظر

مدمقابل : اے مرے آقائے آقایاں، مرے آمرزگار
تازہ زخموں سے ہوا ہے سینۂ ایراں فگار
نونہالانِ وطن داغِ جدائی دے گئے
ساتھ اپنے وہ بہارِ باغِ ایراں لے گئے
جلوہ آرا ہوجیے ایک بار اے مشفق پدر
منتظر ہیں آپ کے دیدار کے سب نوحہ گر

مستزاد

فریاد ہے، فریاد ہے، اے چرخِ ستمگر! اے وائے مقدّر!
واحسرتا، واحسرتا، اے خاطرِ مضطر! ہیہات سراسر!

آقائے قوی دست گئے چھوڑ کے ہم کو ... کیوں ملکِ عدم کو
جا کر کسے دکھلائیں ہم اب زخمِ ستم کو ... اس داغِ الم کو
شہ پور نے ایران کی بنیاد ہلا دی ... سب شان لٹا دی
ناعاقبت اندیشی سے عظمت ہی مٹا دی ... مٹّی میں ملا دی
افسوس رہے باقی جہاز اور نہ جہازی ... قسمت سے ہماری
ناکام ہم سے ہوئی بیڑے کی تباہی ... تقدیر سے اپنی
سہ منزلہ وہ کشتیاں، صد حیف ہماری ... غرقاب ہیں ساری
وحسرتا! اب اشک کا سیلاب ہے جاری ... آنکھوں سے ہماری

(دارا کی روح تربت پر نمودار ہوتی ہے۔)

اے بزرگانِ وطن! اے ہمجلیسانِ قدیم
اے وفاداران سابق، دوستدارانِ صمیم
اے رفیقو! اے عزیزو! اے مصاحب دوستو
آج ایسی کیا مصیبت پیش ہے ایران کو
مبتلا کس صدمہ و اندوہ میں ہیں آپ سب؟
کیوں اذیت روح کو دی، کیوں کیا مجھ کو طلب؟
نالۂ دلگیر سے سینہ زمیں کا شق ہوا!
آہ و زاری سے تمھاری ارض کا دل چھد گیا!
کس پریشانی میں ہے میری رفیقِ زندگی؟
بانوے ایراں کھڑی ہے میری تربت سے لگی!
تربہ میری عقیدت کے چڑھائے ہیں جو پھول
الفتِ دیرینہ کی یہ نذر ہے مجھ کو قبول

ہمنوا احباب نے وہ نالہ و ماتم کیا
قفل ٹوٹا شورِ پیہم سے عدم آباد کا
چونک اُٹھے ہادس میں مُردے آپ کی فریاد سے
کھینچ لائی یہ صدا مجھ کو عدم آباد سے
یوں عروج اسفل سے کرنا اس قدر آساں نہیں
ایک زنداں تیرگی کا ہے بہشت سافلیں
خیر مقدم کے لیے تیار ہیں واں دیوتا
رخصتِ رجعت کو ٹھیراتے ہیں لیکن ناروا
میں وہاں بھی ہوں مگر فرمانروائے مستطاب
آگیا فریاد سُن کر، جاؤں گا لیکن شتاب
پوچھنا ہے مجھ سے جو کچھ بے توقف پوچھ لو
وقت کو خود معترض ہونے کا تم موقع نہ دو
ہاں! ذرا جلدی کہو گزرا ہے تم پر کیا ستم
کس بَلا کے بار سے ایراں ہوا ہے پشت خم؟

طائفہ : (سب مل کر گاتے ہیں۔)

آپ کے حضور میں کُھلتی نہیں مری زباں
لرزہ سا تن بدن میں ہے، باقی نہیں رہی تواں
صولت و رعب و داب سے رعشہ ہے ریشے ریشے میں
حالت زار و حالِ دل کس طرح سے کروں بیاں

دارا : آہ و زاری سے مرے دل پر ہوا گہرا اثر
اس لیے آیا ہوں روحستاں کا ایواں چھوڑ کر
اس قدر مہلت نہیں مجھ کو کہ ہو طولِ کلام
مختصر الفاظ میں سُنیے جواب اپنے تمام
ہو نہ یوں مرعوب ، جو کرنا ہے کرلو وہ سوال
دیر تک یاں ٹھیرنا میرے لیے ہوگا محال

مدمقابل : (گانا جاری ہے)
یوں تو تقاضۂ ادب کہتا ہے حال کہہ سُنا
سانحہ ہے وہ سانحہ جو نہیں قابلِ بیاں
کہتے ہوئے لرزتا ہوں، سانحہ جانگداز ہے
پیشِ حضور سر بسر گنگ ہوئی مری زباں
یارا نہیں کہ داستاں عرض کروں حضور میں
مجھ کو جواب دے گئے ذہن مرا مری زباں

دارا : خیر۔ اگر پاسِ ادب سے تم نہیں کرتے بیاں
یا ہمارے روبرو کھلنے نہیں پاتی زباں
بے تامّل ہم ہی کرتے ہیں سخن کی ابتدا
پوچھتے ہیں بانوے ایران سے کل ماجرا
شہر بانو ! اے نجابت اور شرافت کی پناہ
اے مری دیرینہ محرم ! اے رفیقِ خوابگاہ
ختم کیجے آہ و زاری ، کہیے سارا ماجرا
کیا مصیبت آئی آخر کیا ہوئی آفت بپا؟

ورثۂ انساں میں آیا آفتوں کا سامنا
دامنِ آفات سے ہے عمر کا دامن بندھا
اس جہاں میں آتی ہیں بحری و برّی آفتیں
پیش آجاتی ہیں ارضی و سماوی کُلفتیں

آتسہ : اے شہِ ذی جاہ! دارا! لیجیے میرا سلام
خسروِ ارواح پر ہو رحمتِ یزداں مدام
اس جہاں میں آپ کا ہرگز کوئی ہمسر نہ تھا
کی خدائی آپ نے روے زمیں پر برملا
عیش و عشرت، شادمانی جو ہوئے تم کو نصیب
تھوڑا تھا جتنا بھی اس پر رشک کرتے تھے رقیب
کی بسر انجام تک شاداں و فرحاں زندگی
کیا نہ تھی فرجام تک میمون و خنداں زندگی
سانحہ جو آج یہ پیش آگیا ہے جانستاں
چند لفظوں میں کیے دیتی ہوں میں اس کو بیاں
سب جلال اور اقتدار ایراں کا غارت ہو گیا
فوج غارت ہو گئی، جو کچھ تھا غارت ہو گیا

دارا : مفسدہ نے سر اُٹھایا، یا یہ شہر آشوب تھا؟
کھول کر کیجے بیاں، آخر یہ کیسے ہو گیا؟

آتسہ : یہ نہ وہ، پارس سے فرنگوں اثینہ سے قریب
اک شکستِ فاش سے عسکر ہوا نذرِ رقیب

دارا : کس نے بولا کوچ، آخر کس نے کی لشکرکشی؟
میرے فرزندوں میں سے یہ پیشقدمی کس نے کی؟

آتسر : آپ کے پُرجوش اردِشیر نے حملہ کیا
سونت کے کل ایشیا، وہ نوجواں سب لے گیا

دارا : یہ زیاں انجام حملہ بحری کہ برّی بھی تھا؟

آتسر : بحری اور برّی بھی، یہ دونوں محاذوں پر ہوا

دارا : لیکن آخر کس طرح؟ فوجیں تھیں اتنی بے شمار

آتسر : آبنائے ہلیہ سے گزرے پیادے اور سوار
ل کے چوب و آہن کمیاب ایک معبر بنا
بحر طوفاں خیز پر سے گزری فوج ایشیا

دارا : چوب و آہن! باسفورس، بحر وہ طغیاں بدوش!
تختہ بندی اس کی جس کو دیکھ کر اُڑتے ہیں ہوش!

آتسر : کر دکھایا اس نے یہ! یعنی ہوئی اس کو عطا
روشنیِ طبع ہونے کو گرفتارِ بلا

دارا : اس کے معنی ہیں کہ تھا پردے میں کوئی دیوتا
ہاتھ سے جس کے یہ چشمِ ہوش پر پردہ پڑا

آتسر : لایا اس کج فہمی کا خمیازہ ہم پر وہ وبال
صفحہ تاریخ میں جس کی نہ پائے گی مثال

دارا : خیر یہ آہ و بکا یہ شکوہ میں نے سن لیا
اب ذرا تفصیل سے کیجے بیاں سب ماجرا

آتسر : پہلے بربادی کے حملے میں ہوا بیڑہ تباہ
پھر تباہی کا نوالہ ہوگئی بڑی سپاہ
دارا : کیا ہوئے وہ سب کے سب دشمن کے نیزوں کا شکار؟
آتسر : اپنے فرزندوں کو سوسہ رو رہا ہے زار زار!
ارگ سوسہ رہ گیا سونا
دارا : دریغا! حسرتا!
وا، وفادارانِ عسکر حسرتا! وا حسرتا!
آتسر : باختر کے ہوگئے پژمردہ گلہائے شباب
دارا : پور نا فرجام! یہ تو نے سمیٹا کیا عذاب
وائے! تو نے کر دیے غارت ہزاروں جاں نثار
آتسر : اب گنوا کے شان و شوکت، کھو کے سارا اقتدار
کچھ تھکے ماندوں کو لے کر
دارا : ہے کہاں جانِ پدر؟
خیر سے تو ہے، سناؤ تو مجھے اس کی خبر؟
آتسر : جاں بچا کر نکلا، پسپائی کو سمجھا مغتنم
پہنچا معبر تک جہاں دو سرزمینیں ہیں بہم
دارا : ایشیا میں آ بھی پہنچا، کر کے وہ پل کو عبور
آتسر : اڑ رہی ہے جو خبر، اتنا تو کہتی ہے ضرور
دارا : کیسی تیزی سے ہوا پورا مقدر کا لکھا
گویا قسمت کا نوشتہ پر لگا کر آ گیا

پورِ بد طالع ! یہ ہے زی یوس اکبر کا عتاب
عالمِ بالا سے یہ نازل ہوا تجھ پر عتاب
دغدغہ تو تھا مرے دل میں مگر کہتا تھا میں
پیش گوئی پوری ہونے میں لگیں گی مدّتیں
تیز گامی پر اگر آمادہ ہو جائے بشر
دیوتا ہمیز سے کرتے ہیں اس کو تیز تر
بہہ رہا ہے غم کا سرچشمہ ہمارے واسطے
خود ہمارے اور ہمارے دوستوں کے واسطے
تھا مرا فرزند اُن حالات سے نا آشنا
غیب کے پردے سے ہونے والے تھے جو رونما
اُس پہ غالب آگیا ناداں جوانی کا سرور
آگیا دل میں جوانی کی دلیری کا غرور
بحرِ ایزد باسفورس جو کہ ہے طوفاں بدوش
وہ یہ سمجھا تھا کہ کر لے گا اسے حلقہ بگوش
موجِ ہیلی کو سلاسل میں جکڑنا تھا محال
خام تھا طوفان کو پابند کرنے کا خیال
بند باندھا اس نے نامغلوب سرکش موج کا
جس کے اوپر لے گیا جمِ غفیر اُس فوج کا
یعنی یہ برعکسِ فطرت تھی، زبردستی کی راہ
چوک کی انجام پر اس کے نہ کی اُس نے نگاہ

وہ ہوا پوسائیدوں سے گویا طاقت آزما
اس طرف خاکی نژاد اور اُس طرف بحری خدا
یہ تہوّر تھا سراسر، صاف نادانی تھی یہ
جرأتِ ناکام کی افسوس جہانی تھی یہ
ہوگیا تھا اس کے سر پر اک جنوں گویا سوار
بخت واژوں اور کیا ہے، بس یہی قسمت کی مار
مجھ کو اندیشہ ہے، یہ ہے اب تباہی کا پیام
دولتِ ایران کا اس کو سمجھ لو اختتام
یہ فراہم کردہ دولت، مملکت کا برگ و ساز
خوانِ یغما ہے، بڑھے گا جس پہ ہر دستِ دراز
آتسہ : ناسزاؤں نے پڑھائے تھے اسے اُلٹے سبق
اُلٹا اس کے ہم جلیسوں نے ہی ایراں کا ورق
مُلک گیری پر اسے کرتے تھے مائل روز و شب
طنز سے اُکساتے رہتے تھے اسے مل مل کے سب
رات دن کہتے تھے " اُٹھیے مُلک گیری کیجیے
حوصلہ دکھلائیے، دادِ شجاعت دیجیے
دولتِ ایراں بڑھی ہے نیزہ و شمشیر سے
کشورِ پارس بنی نوکِ سنان و تیر سے
یہ وقار و ثروت و حشمت جو آتے ہیں نظر
ہمّتِ عالی کا یہ خلد آشیاں کے ہے اثر

کیسے کیسے ہو گئے کشور کشا ایران کے
وہ نہ تھے کم حوصلہ زور آزما ایوان کے
آپ بھی دادِ جوانمردی و جرأت دیجیے
اپنی دولت اور خزانوں میں اضافہ کیجیے"
الغرض دن رات اس کے کان وہ بھرتے رہے
جنگجو پر ان کے یہ طعنے اثر کرتے رہے
بدسگالوں نے یہ کہہ کہہ کر بالآخر یہ کیا
حملۂ ہیلاس کا نقشہ جما کر رکھ دیا
رفتہ رفتہ اس مصیبت کا زمانہ آ گیا
اور وہ منحوس منصوبہ یہ دن دِکھلا گیا
وہ ہوا ہے مرتکب اس فعل نافرجام کا
داغ جس کا دامنِ دل سے نہ مٹنے پائے گا
جب سے بخشا حضرت بر جیس نے دیہیم و تخت
ایشیا کے جب سے چرواہے ہوئے فرخندہ بخت
قصر سوسہ میں نہیں پیش آیا ایسا واقعہ
قوم پر ایران کی گزرا نہ ایسا سانحہ
قومِ میدی سے ہوا ایران کا پہلا شہریار
تھی مطیع و ماتحت جس کے رعایا بے شمار
جانشیں نے اس کے جاری رکھا حُسنِ انتظام
خیر سے آغاز خوبی سے ہوا انجام کام

خیر و خوبی سے ہوئی تھی جس طرح وہ ابتدا
حسن سے تدبیر کے کی شہ نے اُس کی انتہا
اس زمانے میں تہوّر کو نہ تھی بیروانگی
رہنما فرزانگی تھی، راہ رو مردانگی
دَور آیا تیسرا شاہنشہ کیروس کا
دولت و ثروت میں جس کا مرتبہ اونچا رہا
اس زمانے میں رعایا کو ملا امن و اماں
تھے عزیز و اقربا اس دَور میں سب شادماں
سچ تو یہ ہے وہ بڑا کشور کشائے عصر تھا
کر لیا زیرِ نگیں جس نے تمام آیونیا
وہ فراست میں بھی اپنے دور میں بے مثل تھا
کر لیے تسخیر اس نے فریجیا اور لیدیا
سب رعایا خوش تھی اس سے، خوش تھے اس سے دیوتا
اقتدار اور دبدبہ اس کا زمانے بھر میں تھا
بعد گورش کے ہوا فرزند اس کا تاجدار
زیرِ فرماں جس کے رہتے تھے عساکر بے شمار
پانچواں مردوس ننگِ ملک و تاج و تخت تھا
شرمِ اپنے دودماں کی وہ شہِ بدبخت تھا
کچھ وفاداروں سے مل کر اردفرنس نے اسے
قتل کر ڈالا محل میں تاکہ وہ فتنہ مٹے

چیدہ چیدہ افسروں سے کر کے پہلے ساز باز
عہد اور پیماں کے آپس کے چھپا رکھا تھا راز
باری آئی پھر مرافس کی، وہ بیٹھا تخت پر
ساتواں اک اور آیا اردفرنس تاجور
بعد اس کے میں نے پھر وہ مرتبہ حاصل کیا
یعنی میں خود ہو گیا ایران کا فرمانروا
معرکے میں نے بہت اپنے زمانے میں کیے
یہ مصیبت میں کبھی لے کر نہ آیا ہار کے
وہ جوانی کے نشے میں اس قدر سرشار تھا
پند پر میری عمل کرنا اسے دشوار تھا
تم ندیم خاص بھی تھے اور مشیرِ مملکت
کیسا مستحکم تھا بتلاؤ سریرِ مملکت
ہاں اُٹھائے ہم نے بھی نقصان، جھیلیں زحمتیں
یوں مگر آنے نہ دیں اس مملکت پر آفتیں

پیش خواں: اے حضورِ مستطاب! اب ہم سے کیا ارشاد ہے
گوش بر آواز ہیں ہم، نہ آپ سے فریاد ہے
منتظر ہیں کیا اشارہ ہوتا ہے فرمان میں
جانِ تازہ کیسے ڈالیں قالبِ ایران میں

دارا: لو سبق اپنی ہزیمت سے، اسے سمجھو ذرہ
حملۂ ہیلاس کا اب پھر نہ کرنا حوصلہ

لے کے دوگنی فوج بھی کرنا نہ تم لشکر کشی
آدمی ہی کیا، زمیں لڑتی ہے خود یونان کی

پیش خواں : اس سے کیا منشا، زمیں ہو جائے گی کیسے حریف؟

دارا : بھوکوں مرجائیں گی فوجیں قحط سے ہو کر نحیف!
جس قدر تعداد ہو، اتنی مصیبت آئے گی

پیش خواں : ایسی صورت ہے، تو پھر تعداد کم کی جائے گی

دارا : چھوٹے لشکر کا گزارہ تو وہاں ہو جائے گا
دیکھنا یہ ہے کہ بچ کر کون واپس آئے گا
بچ کے جو آجائیں گے واپس، وہ ہوں گے چند تن
ورنہ اکثر ان میں سے آکر نہ دیکھیں گے وطن

پیش خواں : آخر ایسا کیا ہے یورپ سے نہ واپس آئے فوج
لوٹ کر آنے نہ دیگی کیا اسے ہیلی کی موج

دارا : غیب کا جو حال بتلاتے ہیں ہم کو دیوتا
ایک حصّہ جس کا ظاہر میں تو پورا ہو گیا
وہ اگر جھوٹا نہ ہو تو پیش آئے گا یہی
ماسوائے چند کے واپس نہ آئے گا کوئی
انحصار ایک چیدہ لشکر پر خیالِ خام ہے
یعنی ان موہوم امیدوں کا بد انجام ہے
وادیٔ رود اسوفس میں وہ سب رہ جائیں گے
اس کی شادابی کو بلکہ فربھی پہنچائیں گے

لاشیں ہو جائیں گی ان کی کشت زاروں کی غذا
فربہی کو موج دریا کے بھی کر دیں گی سوا
کیفر کردار کو ہے ہوشیہ میں انتظار
آفتوں پر آفتوں کے ہونے والے ہیں شکار
وہ غرورِ ملحدانہ، وہ تکبّر کفر کا
جس کی سرشاری میں کی ہیں آفتیں کیا کیا بپا
ان کی پاداش اور اب ان کی سزا ملنے کو ہے
ان کے کرتوتوں کی اب ان کو سزا ملنے کو ہے
سرحدِ یونان میں گھستے ہی پھر کیا کیا کیا
کر دیا غارت گری کا ہر طرف محشر بپا
توڑا پھوڑا مندروں کو، دل میں جو آیا کیا
ان کو لوٹا بھی، جلایا بھی، بِلا خوفِ خدا
سب زیارت گاہیں، درگاہیں، معابد، خانقاہ
کر کے سب مسمار انھوں نے کر دیئے بالکل تباہ
منبروں سے بُت گرائے، کھود دیں بنیادیں تمام
بتکدوں کے فرش اکھاڑے، عام بولا انہدام
معبدوں کے وہ قدیم آثار، تھے جو یادگار
کھود پھینکے بے دھڑک، اور توڑ پھینکے سب مزار
زیادتی میں انھوں نے چھوڑی نہیں کوئی کجی
اب بُھگتنا ہے انھیں بھگتان اس کا لازمی

اوچھی سوتوں سے نہ نکلیں گی اب ان کی کلفتیں
تازہ شر آٹوں میں اُبلیں گی زمیں سے آفتیں
کھینچ دیں گی دوریہ کی برچھیاں، اب کلک دار
مرگ خوں غلطیدہ کے میدان میں نقش و نگار
سرزمیں پالاتیہ کی ہو گی خوں سے لالہ زار
قسمتِ ایران میں لکھی ہے یہ خونی بہار
تین پشتوں تک اِنھیں خاموش کشتوں کا یہ بار
چشمِ عبرت کو سبق دیتا رہے گا بار بار
اور وہ کہتا رہے گا یہ زبانِ حال سے
"کبر کے دعوے نہیں ہرگز بشر کے واسطے"
"زعم سے ہوتا ہے پیدا خرمنِ رنج و الم"
"کاٹتا ہے کبر کی کھیتی سے انساں یاس و غم"
جانچو ان باتوں کو، پاداشِ تکبر جان لو
اور ہیلاس و اثینہ پر ذرہ تم دھیان دو
دیوتاؤں کی ہوئی ہیں تم یہ کیا کیا بخششیں
حضرت دادار نے دی ہیں فراواں نعمتیں
باز آؤ حرص سے، کفرانِ نعمت سے ڈرو
حضرت باری کے در پر شکر کے سجدے کرو
یہ نہ ہو رہ جائے جم کر اس طرف تو چشمِ آز
تازہ تر انعام پر دیتا ہے جو وہ بے نیاز

اور ادھر وہ دیوتا یہ حرص کی تعزیر دیں
آج تک جو کچھ ملا تھا، وہ بھی تم سے چھین لیں
معدلت گستر جہاں کا وہ خدائے مشتری
لافزن کی سرزنش کرنے کا ہے خود مدعی
عدل ہوتا ہے گراں اس کا تکبّر کے لیے
ہے سزائے سخت اس کے ہاں تبختر کے لیے
اس لیے جب آئے واپس میرا پُور بدنصیب
پیش آئیں اس سے شفقت سے سب ایرانی نقیب
گفتگو میں ہاں مگر تادیب کا پہلو رہے
تاکہ وہ اپنی کہے اور بات اوروں کی سُنے
باز آئے ایسے منصوبوں سے جو ہیں بے لگام
موجب خفگی ہیں یہ سب، دیوتاؤں کے تمام
شہر بانو اب ذرا اپنے محل میں جایئے
اور ایک شایان شاں پوشاک لے کر آیئے
آپ کا فرزند تھوڑی دیر میں آنے کو ہے
اور لباس پارہ پارہ اپنا دکھلانے کو ہے
اس کی وہ پوشاک زردوزی تو ہی اب چاک چاک
ہے مگر یہ غم کی زردوزی کا جامہ پُرتپاک
اور باتیں چھوڑ کر دلجوئی پر رکھنا نظر
مہر مادر اور شفقت میں ہے مرہم کا اثر

زخم دل کے واسطے مرہم جہاں درکار ہے
سو دواؤں کی دوا ایک مونس غمخوار ہے
آگیا اب وقتِ رخصت شہر بانو خیر باد!
میرے دیرینہ ندیمو، ہم جلیسو، خیر باد!
عالم تاریک کو اب ہم عدم کے گھر چلے
یاد رکھنا "جب تلک بس چل سکے ساغر چلے"
مبتلا ہو کر مصیبت میں بھی جو مہلت ملے
کاٹنا عیش و طرب میں جس قدر فرصت ملے
مال و دولت آنکھ بند ہوتے ہی سب بیکار ہے
درحقیقت زندگی ہی دولتِ بیدار ہے

(روح نیچے اُتر جاتی ہے)

پیش خواں : سن کے حال غیب اور ابنائے ایراں کا الم
سن کے جو پیش آئے ہیں اور پیش آئیں کے ستم
نوحہ گر ہوں ——————

آتر : —————— داورا! کرنے کو میری پشت خم
کس قدر ہوگا گراں پشتارۂ اندوہ و غم
ہو گیا دل ٹکڑے ٹکڑے سُن کے یہ قصہ مرا
آئے گا محلوں میں غم سے چُور شہزادہ مرا
ہائے! میں دیکھوں گی اس کا چاند سا مکھڑا اُداس
ہائے! یہ آنکھیں دکھائیں گی پھٹا اس کا لباس

اب چلوں، لاؤں لباسِ فاخرہ اس کے لیے
لال میرا وہ پھٹی پوشاک کیوں پہنے رہے
رنج کے عالم میں ہوگا، اور گھبرائے نہ وہ
ہاں دلاسے سے کہیں محروم رہ جائے نہ وہ
(محل میں چلی جاتی ہے)

مناجات طائفہ

کیا شان تھی کیا عظمت کیا دور تھا ایراں کا
کیا دبدبۂ شوکت تھا سوسہ و ہمداں کا
خورسند رعایا تھی، خوش وقت زمانہ تھا
خوش حال تھے وابستہ، کیا دور تھا دارا کا
جو ملک تھے وابستہ رشتے میں اطاعت کے
امصار و بلاد ان کے سب تابع فرماں تھے
دارا کا زمانہ تھا کیا روز سعید ان کا
تھے نصر و ظفر اس کے وہ خسروِ فاتح تھا
اس میں نہ تھی کیا خوبی، اور شانِ خداوندی
جب تک کہ رہی ہاتھوں میں باگ حکومت کی
مدمقابل: امصار و بلاد اپنے آئین میں محصول تھے
اور قرب سے لشکر کے سب پارسی مامون تھے
بے فکر تھے سب شہری، اور بے غل و غش دہقاں
محفوظ تھے ایرانی مصؤن تھا کل ایراں

وہ معرکوں سے پھر کر آتے نہ تھے بے عزت
لاتے تھے غنیمت کی وہ بیش بہا دولت
ہوتے نہ تھے وہ خستہ اور ماندہ مسافت سے
گھر آتے تھے وہ نازاں بھرپور غنیمت سے

مقابل: کھینچ دی ہے گو کہ بحر ہیلیہ نے اپنی حد
ایشیا سے آ کے ملتا ہے جہاں پر اس کا مد
اور اگرچہ پارسی اس حد کے اندر ہی رہے
اُن کے آگے کیسے کیسے شہروں کے تھے سر جُھکے
سر ہوئے خم جن کے کیا کیا شہر تھے وہ شاندار
دولت ایراں میں ہوتا تھا کبھی جن کا شمار
تھریس تک یورپ کی حد میں جس قدر ہے مرز و بوم
معرکہ آرائی ایراں کی تھی اس سب میں دھوم
جو جزیرے بحر سطریموں کے تھے نزدیک تر
سنتے ہی جھنکار ترکش کی جھکا دیتے تھے سر
دور ساحل سے، خلیج اور آبنائے سے پرے
شہر تھے کیا کیا کمربستہ فصیلوں سے کھڑے
تھیں ان کی فصیلیں اونچی برج دار
آسماں سے باتیں کرتی تھیں جو مثلِ کوہسار
خوش تھے وہ اس سے کہ ایرانی تھا ان کا شہریار
تابعانِ دولت ایراں میں تھا ان کا شمار

وہ بلاد ساحلی بھی ان میں شامل تھے تمام
جن کے عالیشان بالاخانے، غرفے اور بام
سینۂ ساحل پہ آتے تھے نظر جیسے کہ ہار
جگمگاتے تھے پردپن تس پہ وہ ییل نہار
جس جگہ سنگم ہے ہیلی اور پروین تس کا
آتی تھی بیٹھے گلے کے غرغرانے کی صدا
بحر اسود کی یہاں آواز ہے بیٹھی ہوئی
یوں صدا اس کے دہانے کی ہے گویا غرغری
دو جزیرے ہیں کنارِ ایشیا کے سامنے
سینے اپنے پہرہ داروں کی طرح تانے ہوئے
ہیں یہاں کی اوس اور لیسبوس میں وہ تاکزار
بادۂ انگور کے جن میں چمکتے ہیں شرار
تیسرے ساموس کے شاداب ہیں زیتون زار
لہلہاتے ہیں شجر جن میں قطار اندر قطار
ہیں جزیرے تین ان کے پاس ہی کے موج بوس
ایک میقونوس، ایک فاروس اور ایک ناقسوس
بحر کی موجوں میں ہیں تینوں نگینے سے جڑے
بھائی بھائی سے نظر آتے ہیں موجوں میں کھڑے
ایک جزیرہ اور بھی نزدیک ہی طینوس ہے
پاس ہی اس کا پڑوسی نام کا اندروس ہے

مدِ مقابل: ہیں جزیرے اور باقی خطۂ یونان کے
تھے مطیع و ماتحت جو دولتِ ایران کے
دو رُخا لیمنوس آتا ہے نظر یوں دو دِلا
تھریس کی جانب ہے اک رُخ ایک سوے ایشیا
اس جزیرے پر گرا ایقارسِ دیدا لوی
جس نے ہمت کی پرندوں کی طرح پرواز کی
دو جزیرے پاس کے شاہد ہیں ان حالات کے
یعنی رودِس اور تندِس ہیں گواہ اس بات کے
شہر سب چھوٹے بڑے قبرص کے بھی منقاد ہیں
مثل بُافس اور سولائی کہ جو آباد ہیں
نیز اُس ام القریٰ سلمس نے شہرت پائی ہے
دخترِ ہمنام نے جس کی یہ آفت ڈھائی ہے

مستزاد:

شہر مالا مال تھے جو خطۂ یونان کے ۔ کس شکوہ و شان کے
فیض وہ دانشوری کا شاہ کی پاتے رہے ۔ شہ کے گن گاتے رہے
جاری تھا دارا کا ان میں سکّۂ دانش وری ۔ یعنی رمزِ خاوری
تھی صلاح و پند سے ایران کی واں سروری ۔ تھی اسی میں بہتری
تھے مسلح مختلف اقسام کے لشکر یہاں ۔ سب ہمارے درمیاں
حضرت دارائے اعظم جن کے تھے روحِ رواں ۔ خاورِ ذی عز و شاں
متحدہ قوتیں یعنی کہ ایرانی سپاہ ۔ تھی بڑی پشت پناہ
عظمت و اجلال کا ایران تھا آماجگاہ ۔ جس پہ پڑتی تھی نگاہ

لیکن اب وہ موج تو افسوس کروٹ لے چکی | داغِ حسرت دے چکی
تلخ کر دی دیوتاؤں نے ہماری زندگی | جن کی یہ تعزیر تھی
اُن سنان و نیزہ و امواجِ تند و تیز نے | روزِ رستاخیز نے
ختم کی ایراں کی طاقت، زخم وہ کاری دیے | موج کی تلوار سے

اردشیر دور سے کہتا ہوا آتا ہے۔ (نوحہ)

اردشیر : وا دریغا! حسرتا! ضرب کیا کاری لگی —
کیا اچانک چوٹ تھی "دُرّہٗ" دادار کی
فرش ایراں کو کیا، تازیانے نے ترے
یا خدا، یا آہورا! کیا سزا سخت دی
آج کا منحوس دن سخت ہے میرے لیے
آئے ہیں سب محترم پیشوائی کو مری،
وا مصیبت! دیکھ کر ان بزرگوں کو یہاں
زانوؤں میں لگ گئی آج میرے کپکپی
کاش رہ جاتا وہیں ساحلِ غربت پہ میں
ہیں دلاور جس جگہ تیرگی میں موت کی
خوں میں غلطاں ہی سہی وہ مگر آسودہ ہیں
ختم ہو جاتی وہیں کاش میری زندگی

پیش خواں : اے شہِ انجم سپاہ! حسرتا وا حسرتا!
آج ہے ماتم بپا سوس کے اشراف کا
ہائے وہ شہزادگاں جن سے تھی ایراں کی شاں
آپ کے تھے ہمعناں، ان کا ماتم ہے بپا

ہم کو جن پر ناز تھا، وہ عمائد کیا ہوئے
ان کی گردن پر پھری حیف کیا تیغِ قضا؟
جن پہ تھا ایراں کو ناز، وائے شاہنشاہ نے
عالمِ ظلمات کو ان کا مسکن کر دیا
عالمِ تاریک کے قصر و ایواں میں تمام
جا بجھے وہ شب چراغ یاں اندھیرا رہ گیا
جادۂ ظلمات پر ہو چکے وہ گامزن
سینکڑوں ابنائے ملک، کیجیے آہ و بکا
غنچہ ہائے ایشیا، یعنی ریحانِ شباب
ہو گئے کتنے ہزار، راحلِ ملکِ بقا
اور ہزاراں وہ ہزار وہ کماں داران فوج
وا دریغا! ہو گئے راہیِ تحت الثریٰ
آج وہ کڑیل جواں، وہ قوی ہیکل شجاع
اب نہیں آتے نظر، اب کہاں ان کا پتا
کورنش کیجے قبول، خم ہے زانوے نحیف
بن گیا ماتم سرائے، آج سارا ایشیا

(اس موقع پر ایشیائی سوز خوانی، شیون و ماتم شروع ہو جاتا ہے، سینہ کوبی ہوتی ہے اور سخت شورِ ماتم بپا ہوتا ہے۔ گویا یہ قومی مصائب پر قومی عزا داری ہے۔)

مقابل : نوحہ

غارتگرِ ناموس ہوں، رسوائے جہاں ہوں — وا چرخِ ستمگر
سرچشمۂ رسوائی ہوں، ایراں کی خزاں ہوں — زاری کرو مجھ پر
اک دن تھا کبھی شاہ تھا میں صاحبِ عظمت — اب بارِ وطن ہوں
ادبارِ وطن ہو گیا میں، بلکہ نحوست — اب خارِ وطن ہوں

پیش خواں :

نوحہ گر موجود ہیں سب پیشوائی کے لیے — آ کے مرنیدان سے
شیون ان کا روح فرسا جانگدازی کے لیے — شہرۂ آفاق ہے
سُنیے ان کا نوحۂ پُردرد اور آہ و بُکا — روتے ہیں یہ زار زار
سُنیے سُنیے پادشاہا! سُنیے نالے کی صدا — روئیے زار و قطار

اردشیر :

وہ آہ و فغاں کیجیے جو چیر دے دل کو — جانسوز ہوں نوحے
ایکبارگی جو آ کے لگیں تیر سے دل کو — وہ کیجیے نالے
جو بھیجتا تھا نعمتیں اگلوں کو ہمارے — ناراض ہے مجھ سے
ہیہات ہے ہیہات کہ منہ پھیرا ہے مجھ سے — ایراں کے خدا نے

پیش خواں :

نالہ ایسا چاہیے جو جان و دل کو پھونک دے — روئے رلوائے
ہاں سیہ بختی کا افسانہ ذرا دُہرائے — زخم دل دکھلائے
کیسی تھیں وہ خون سے رنگین موجیں بحر کی — کچھ ذرا فرمائیے
اور ان کی پیشوائی کشتگاں کی کیسی تھی — یاد تو دلوائیے

آج کے دن شہر میں گھر گھر میں ماتم ہے بپا — نوحہ ہے اولاد کا
سُنیے سُنیے بادشاہا! سُنیے نالے کی صدا — کیجیے آہ و بکا

مقابل۔ اردشیر:

ق۔ افلاک تھے خود لشکرِ یونان کے حامی — آریس تھا ساتھی
یعنی کہ کماں دار، حمل کا جو ہے والی — خود اس نے ہماری
کھیتی کی طرح کاٹ دھری فوج ہی ساری — خشکی و تری پر
لشکر سے بھری کشتیوں پر اس کی درانتی — چلتی تھی برابر
اور خونی سمندر میں ڈبو کر سب عساکر — یہ زور دکھایا
اس ساحلِ منحوس پہ ہیلاس کے آخر — مٹی میں ملایا

پیش خواں:

نالۂ جانکاہ کیجے، پوچھیے ان سے سوال — لیجیے ان سے جواب

طائفہ:

آیا کیا ان ہمنشینوں اور رفیقوں پر وبال — جو گئے تھے ہم رکاب؟
داتمس، باشام، فارنداق اور وہ سوسکار — تھی کڑی جن کی کماں
سوس واگد آباد کے شہ زور وہ پیل دماں — کیا ہوئی ان کی تواں
محلوں کا ہمداں کے اک انبوہ اے شاہ جہاں — آپ کے تھا ہمعناں
جو ہوا تھا اکتبانہ سے روانہ کارواں — وہ گیا آخر کہاں؟

مدمقابل۔ اردشیر

اک جہازِ صُور سے، کھا کے غوطہ بحر میں
وہ شناور رہ گئے ہو کے غوّاصِ عدم

ساحل سلمیس پر، سنگِ ناہموار پر
محو ہیں اب خواب میں سرفروشانِ عجم
سنگلاخ، اور خونچکاں بلکہ خوں آشام ہے
ان کا بسترِ مرگ کا، وا دریغا، وا ستم!
اب نہ جاگیں گے کبھی، نیند سے وہ موت کی
وائے حسرت کشتگاں! کشتگاں وائے الم!

پیش خواں :

نالۂ دلدوز سے! کیجیے ان سے سوال
پایئے اپنے جواب

فارنق اور کریو مارو بھی ہوئے کیا پائمال؟
اے حضورِ مستطاب؟

سیوالیقِ ذی قدر اور ایلیسِ عالی گہر
اے خدیوِ بحر و بر

والیانِ میمفسیہ تاربس، آمیستر
سب گئے آخر کدھر؟

ہست اکمس اور اردعنبر گئے آخر کہاں؟
اے حضورِ والا شاں

عازمِ ہیلاس ہو کر سب گئے تھے ہمعناں
چھوڑا ان سب کو کہاں؟

مقابل :

ڈالی شہر یاستاں یعنی اٹینہ پر نظر
انھوں نے گو بے خطر

کر لیا لقمہ نہنگِ موت نے اُن کو مگر
اک جھپٹّا مار کر

بسملوں کا اجنبی پردیس گورستاں بنا
تھا یہی حکمِ قضا

چھوڑ آئے ہم سسکتا اور انھیں کراہتا
ساحلِ ہیلاس پر

طائفہ : آپ کا فرزند بطنوفس جو نورِ دیدہ تھا
کیا ہوا وہ باوفا

چھوڑ آئے ساحلِ سلمیس پر اس کو بھی کیا
ہائے اس کو کیا کیا؟

اوبرس اور فارطس جو تھے شجاعانِ وغا — آخر ان کا کیا ہوا؟
کیا عدو امواج کے ان کو حوالے کر دیا — آپ نے یہ کیا کیا؟
کیا کیا شہزادگان پارس کو آخر شہا! — کیا ہوئی آفت بپا
کیا سمندر اور دشمن کے حوالے کر دیا — وا دریغا حسرتا!

مدمقابل : (نوحہ)

وا دریغا حسرتا! وا دریغا حسرتا!
تند ہے کیسی فغاں، کس بلا کی ہے بکا!
چھیدتا ہے یہ مرے استخواں کے مغز کو
روح فرسا، جانگزا تم نے جو نالہ کیا
ہاں مجھے گنواؤں تم میرے محبوبوں کے نام
بس اسی آواز کو دل ہے میرا چیختا

طائفہ :

دل میں ہوتا ہے سوس ایک اور کے انجام سے — صدمہ و آلام سے
اس امیرِ مردیانی زانطس کے نام سے — اس کے بد فرجام سے
وہ سبک رفتار اربق، وائی اقسس نامدار — آپ کے وہ شہسوار
بادپا گھوڑوں کے مالک رخش و توسن کے سوار — کیا ہوئے وہ ذی وقار؟
آنکاریس مرد میداں وہ جری پرخاش جو — کیا ہوا وہ تند خو؟
لائی سمنہ کیقباد اور تلمز سیماب جو — مضطرب پیکار جو
جس کے اوپر چتر ہے اس رتھ کے پیچھے تو نہیں؟ — آپ کے وہ ہمنشیں؟

مقابل۔ اردشیر :

سب کے سب سالار ہیں ملکِ عدم میں جاگزیں — اب کہیں زیرِ زمیں

طائفہ : گُم ہوئے ایسے کہ اب ان کی نہ آئے گی خبر
اردشیر : سانحہ ہے ہائلہ!
طائفہ: بام پر آلام کے ہم سب کے ہے پیشِ نظر سخت ہے یہ واقعہ
دیوتاؤ! یہ ہمارے ساتھ تم نے کیا کیا کیا نظارہ بن گیا
اب مدارات اپنی آنکھوں کی ہے آٹھے کر رہا وہ فرشتہ موت کا

مدمقابل۔ اردشیر:

ہم ہیں وہ آفت زدہ جن کو کوئی چارہ نہیں تلخ ہے اب زندگی
یہ بلائے آسماں ہے جس سے چھٹکارہ نہیں اب نہیں درماں کوئی
انتقام چرخ نے ہیہات کر ڈالے ہلاک نوجوانانِ وطن
یہ مصیبت سی مصیبت ہے بلا کی ہولناک! وائے اے چرخِ کہن
طائفہ: کیا ہی روز بد تھا جس دن ہم نے ٹھانی جنگ کی جنگجو یونان سے
شان ساری دولت ایران کی گہنا گئی ان کی بحری شان سے

مقابل اردشیر: ضرب ان افواج کے ہوتے ہوئے کاری لگی
طائفہ : کیا عظیم الشّان طاقت تھی جو مٹ کر رہ گئی
اردشیر: دیکھیے کل مملکت کا یہ بقیہ دیکھیے
باقی ماندہ میرا یہ رخت دریدہ دیکھیے
طائفہ : وائے حسرت! دیکھتے ہیں ہم ستم کش۔
اردشیر: ۔ دیکھیے
ہاں خدنگ و تیر کا یہ خالی ترکش۔ دیکھیے
طائفہ: آپ کیا فرما رہے ہیں خالی ترکش!
اردشیر: ہاں یہی!

یعنی لے دے کے بچا ہے خانۂ بیکاں یہی!

طائفہ: کس قدر تھا ساز و ساماں اور بچی یہ ہیچ شے

اردشیر: وائے! بے یار و معاون رہ گیا!

طائفہ: افسوس ہے!

کیا وہ یونانی سناں سے بھی نہیں مُنھ موڑتے؟

اردشیر: توبہ توبہ! وہ بھلا میدان ہیں کب چھوڑتے!

دیکھے ہیں خود آنکھ سے ہنگامہائے کارزار!

طائفہ: معرکہ بحری بھی دیکھا، اور وہ اس کا فرار؟

اردشیر: کیوں نہیں، اس پہ کیا میں نے گریباں اپنا چاک

طائفہ: وائے ویلا! وائے ویلا!

اردشیر: اس سے بڑھ کر دردناک!

یہ الم سنگین تر ہے سخت تر آلام سے

طائفہ: بد سے بدتر دن دکھایا روز نافرجام نے

اردشیر: تازیانہ ہم پہ ان کا شادیانہ ہو گیا

رنج اپنا ان کی راحت کا بہانہ ہو گیا

طائفہ: قوت بازو گئی اور دے گئی طاقت جواب

بے جنازہ فاتحہ۔

اردشیر: کیا ہوا نازل عذاب

طائفہ: دوست سارے جاں بحق ہو کر سلامس میں رہے

آپ کے احباب مُردوں کی مجالس میں رہے

اردشیر : آنکھ سے آنسو بہاؤ، جاری کرو آبِ شور
آنسو بہاتے ہوئے ، ساتھ محل کے چلو

طائفہ : آنکھ میں ہے آبِ شور، دل میں ہے نالے کا شور
آنسو بہاتے ہوئے، چل رہے ہیں قصر کو

اردشیر : شورِ جرس ہو بلند

طائفہ : وائے ستم پر ستم

اردشیر : شورِ جرس تیز تر ، نالہ و شیون کرو

طائفہ : وزنی و کاری تھی ضرب

اردشیر : سخت ہی بھاری تھی ضرب
آنکھوں سے جاری ہیں اشک، دل میں بلا کا ہے کرب
اب دھڑا دھڑ پیٹیے ، خوب ماتم کیجیے
بچیوں سے سوگ کے، غم کی نیّا کھیے

طائفہ : سینہ کوبی کرتے ہیں ، پیٹتے ہیں دم بدم
اپنی تیرہ بختی کو رو رہے ہیں آج ہم
بچیوں سے رنج کے کھے رہے ہیں ناؤ کو
زور سے اور چیخ کر نالہ و ماتم کرو
یہ ہے ستم پر ستم

اردشیر : نالہ و شیون کرو
جیسا کہ میں نے کہا ، بانگ جرس تیز ہو
نالہ ہو آہن گداز، نوحہ محشر خیز ہو

طائفہ : نالۂ پُر جوش یہ درد سے لبریز ہے
ہے بلند اور تیز تر اپنے نالے کی صدا
حسبِ منشا آپ کے کر رہے ہیں نوحہ ہم
نالۂ جاں سوز ہے آپ نے جیسا کہا

اردشیر : آہ پر ہو آہ سرد

طائفہ : نالے پر نالہ بھی ہے
آہ پر ہے آہ سرد، نوحے پر نوحہ بھی ہے

اردشیر : سینہ کوبی ہو مثالِ ماتمِ مائیشیہ
یعنی طوفاں خیز ہو نوحہ گردوں کا مرثیہ

طائفہ : ماتمِ مائیشیہ ہاں ماتمِ مائیشیہ
ایک طغیانیِ الم ہے یہ ہمارا مرثیہ

اردشیر : یہ بزرگی کی نشانی اپنی ڈاڑھی نوچ دو
ٹھوڑی پر سے برف سی، گالا سی، ڈاڑھی نوچ دو

طائفہ : اپنی یہ ریشِ سپید نوچتے ہیں. برف سی
برف گوں ریشِ سپید، یہ لیجیے یہ نوچ دی

اردشیر : پھر کرو آہ و فغاں، جوش سے اور زور سے

طائفہ : کر رہے ہیں ہم فغاں، بیخ کے اور زور سے

اردشیر : اپنی پوشاک سپید یہ چیر پھینکو سینے سے
ہاں دکھاؤ زخمِ دل، مثل اک آئینے کے

پیش خواں : پھاڑ ڈالا لیجیے ہم نے یہ ملبوس پاک
پیرہن بھی چاک ہے اور گریباں بھی ہے چاک

اردشیر: یہ بزرگی کا نشاں سر سے اپنے نوچ دو
اور سر کو پیٹ کر کشتوں کا ماتم کر دو

پیش خواں: لیجیے یہ سر کے بال پھینکتا ہوں نوچ کر
کشتگاں کے واسطے بہہ رہے ہیں اشکِ تر

اردشیر: اس قدر روؤ کہ ہو جائے تمھاری دھندلی آنکھ
طائفہ: تیرتی ہے اشک کے سیلاب میں یہ اپنی آنکھ
اردشیر: نالۂ جرس کرو تیز تر، بلند تر
پیش خواں: داغ پر یہ داغ ہے وائے چرخِ فتنہ گر
اردشیر: رنج سے گداز دل، لے کے سینے میں چلو
لے کے خوں شہیدوں کا آبگینے میں چلو

پیش خواں: ہم قدم اٹھا رہے ہیں آپ ہی کے ساتھ ساتھ
ہم محل کو جا رہے ہیں آپ ہی کے ساتھ ساتھ

اردشیر: آج ساری بستی غم سے گونج اٹھنی چاہیے
طائفہ: کوچے کوچے سے صدائے رنج اٹھنی چاہیے
اردشیر: نازک اندامان سوسہ اب دھرنہ ہلکے قدم
پیش خواں: اب قدم آہستہ ہیں آ گئی یہ کشتِ غم
اردشیر: ان جہازوں نے ایاقس کے کیا غارت ہمیں
ان سہ عرشہ کشتیوں نے کر دیا غارت ہمیں

پیش خواں: وقتِ رخصت آ گیا، لیجیے، گھر جائیے
اور اشکِ تر عناں گیری کو لے کر جائیے

(رخصت ہوتے ہیں)